حسب فرمائش

سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم دریا گنج دہلی

بار اوّل | (تعلیمی پریس دہلی) | قیمت فی کاپی عمر

دیباچہ

ع۔ چھوٹ پڑتے ہیں تماشہ اس چمن کا دیکھکر

کوسلر کے خیال میں آرٹسٹ کا کام تلقین کرنا نہیں مشاہدہ کرانا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کا اثر اس پر اس قدر ہوتا ہے کہ وہ اسے جوں کا توں دوسروں کو دکھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اور جس طرح وہ اسے اوروں کو دکھاتا ہے وہ اچھا ہے کہ نہیں، وہ خود نہیں جانتا یا وہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ کام دیکھنے والے خود کرتے ہیں۔ آرٹسٹ اگر کامیاب ہے تو اس سے حقیقت نمائی اس قدر ہو ہی جاتی ہے کہ دیکھنے والے بھی اپنا کام کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بیرنگ نامے استاد کیفی کے فرمان کے مطابق "سماج کی دکھتی رگوں کی عکس ریز تصویریں ہیں"۔ اور یہ تصویریں کیسی ہیں ذرا سید اختر حسین اختر کی زبانی سنئے:-
"بیرنگ نامے پڑھکر محسوس ہوا گویا میں چند ٹوٹے ہوئے دلوں کی داستانیں اپنے دل کی زبانی سن رہا ہوں۔"

میں برنارڈ شا کا معتقد نہیں جو کہتا ہے "میں اپنی تعریف کے لئے دوسرا آدمی کیوں لاؤں جب میں خود اپنی تعریف کر سکتا ہوں" تاہم میں ایک دو باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ میں نے یہ نامے لکھنے کی خاطر کبھی نہیں لکھے۔ میں نے انھیں فقط اس حالت میں لکھا جب میں لکھے بغیر نہ رہ سکا یعنی زمانے کی ٹھوکروں نے میرے دل کو ایسا ہلایا کہ اس میں سے

پُر درد آوازیں آنے لگیں۔ پس ان پُر درد آوازوں میں ایک ایسے حساس دل کی داستان مخفی ہے، جس کو دنیا کی آپا دھاپی، موجودہ تعلیم کی عریانی، شادی کی لاٹری، ہندو مسلم کشیدگی، پیشے کے غلط انتخاب، دوستوں کی بے وفائی، دیس کی غریبی، بیسوا کی بے جا ناقدری، اچھوت سے بدسلوکی، اور مذہبی جنون کے غیر فطری واقعات نے خود سے بیخود کر دیا۔

دوم۔ یہ رنگ نامے اس وقت لکھے گئے تھے جب کہ ہندوستان تھا اور ابھی بھارت اور پاکستان میں نہیں بٹا تھا۔ ملکی بٹوارہ کے خونی ہنگاموں کے دنوں میں کتاب کا مسودہ میرے باقی سامان کے ساتھ پاکستان رہ گیا تھا جسے ابھی ابھی ایک صاحب مہربان نے مجھ تک پہنچایا ہے۔ التماس ہے اگر کسی نامے کے کسی حصے سے آج کل کی فضا کے تقاضے سے کسی قدر ناگوار احساس کا احتمال ہو تو اسے نظر انداز کیا جائے۔

دہلی ۲۷ اگست ۱۹۵۰ء

زندہ پیر ایم اے

خیالات کا اظہار اور مشاہدے اور تجربوں کا بیان کئی طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ نظم کو رہنے دیجئے۔ نثر میں ناول، مضمون، اور افسانچہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ مستعمل ہیں۔ مگر رندھیر صاحب نے جو طرز اختیار کیا وہ بہت کچھ ندرت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ یعنی نامے کا طرز اور ان کو اس طرز کے نباہنے میں کامیابی بھی ہوئی ہے ان ناموں کا موضوع معاشرت کے بعض نقائص اور سماج کی دکھتی رگوں کی عکس ریز تصویریں ہیں۔ جو کچھ روز ہوتا ہے اس کی عکاسی ان خطوں میں ہے۔ خط لمبے ضرور ہیں مگر خط ہی رہے مضمون نہ بننے پائے۔ واقعیت کی عکاسی ویسے تو بہت سہل ہے لیکن اس کو ذاتی پسند و تعصبات سے بچانا مشکل ہے۔ یہ عکاسی بے کم و کاست ہونی چاہیئے۔ رندھیر صاحب اس رمز کو سمجھ گئے اور انھوں نے احتیاط سے کام لیا۔

بعض نامے یا بعض ناموں کے بعض حصے ممکن ہے بعضوں کو ناگوار گذریں مگر کیا
ع مثل آئینہ رو بہ رو گویا۔ ہر عمل ر[illegible] والا سماج کے شکریے کا مستحق نہیں۔ واقعیت اگر مبالغے کے لوث سے پاک ہو تو اس کے اظہار پر ناک بھوں چڑھانا کیا معنی؟ بلکہ سماج کو رندھیر صاحب جیسے لوگوں کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کہ انھوں نے لاگ لپیٹ سے کام نہ لیا اور اصلی حالت کو جوں کا توں سامنے لا رکھا۔ بعض عیوب کے مجوزہ مداوا سے ممکن ہے کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن عیب کی ہستی سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیا یہ کم خدمت ہے کہ کسی کو اس

سکے نقائص سے آگاہ کیا جائے۔

رندھیر صاحب کے بیان میں سلاست ہے۔ اُن کا اسلوب سہل اور دلچسپ ہے اور زبان فصیح ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ مصنّف کے جذبات کی قدر کی جائے گی اور یہ نگینے مُلک میں مقبول ہوں گے۔

۲۴ر اپریل ۱۹۴۷ء

برج موہن دتاتریہ کیفی

(۱)

اس کے نام جس نے ہمیشہ اصل کو نقل اور نقل کو اصل

مانا۔ جس نے نہ کبھی اپنے تئیں اور نہ

دُنیا ہی کو سمجھا۔۔۔ جس نے اپنی

کوتاہ نظری کو دوسروں

سے منسوب

کیا

جی بجا فرماتے ہیں!

واقعی میں گول مول کہتا ہوں۔ میں نے گول مول جواب دیا ہے کیونکہ تمہارا سوال
ہی گول مول تھا۔ تو سنو! دنیا میں ہر چیز گول مول ہے۔ میں گول مول پیدا ہوا جس کا
نہ ہاتھ کھلا تھا نہ منہ۔ بس ایک تھیلی دار گول مول تھیلے میں ماں کے گول بطن سے پیدا ہوا۔
ابھی تک میرے نام کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ کوئی مجھے کسی نام سے پکارتا ہے کوئی کسی سے۔
نہ معلوم کہاں سے آیا ہوں۔ نہ معلوم کیوں جی رہا ہوں اور قطعاً پتہ نہیں چلتا کہ مر کر کہاں
جانا ہے۔ کب تک جینا ہے؟ کس منٹ اور سیکنڈ پر یہ گول مول زندگی ختم ہوگی۔ ایسی محدود
اور غیر یقینی زندگی سے ہم کیوں لپٹے پھرتے ہیں۔ جب یہ محدود ہے اور نہ صرف محدود ہے بلکہ
غیر یقینی بھی پھر ہم اس پہ اتراتے کیوں ہیں؟ آخر زندگی کہتے کسے ہیں؟

پہلے مجھے بچہ کہتے تھے۔ مجھے کوئی علم نہ تھا کہ بچپن کیا ہوتا ہے؟ میں بچہ کیوں
ہوں؟ دوسرے کیوں بچے نہیں۔ پھر مجھ کو نوجوان کہنے لگے۔ مگر میں نہ سمجھا جوانی کیا ہے
میں جوان کیوں ہوں؟ دوسرے کیوں جوان نہیں؟ اب سنتا ہوں جوانی گزر جاتی ہے۔ مگر
سمجھ میں نہیں آتا کہ جوانی کیوں گزر جاتی ہے، کس طرح گزر جائے گی اور گزر کر کہاں جائے
گی؟ نہ معلوم جوانی کے ساتھ ساتھ میں بھی گزر رہا ہوں یا میری جوانی ہی گزر رہی ہے میں ساتھ
جوان اک گول مول پیرائے میں گزر رہا ہے۔

مجھے ہر چیز ہی کہتا ہے یہ اس کی بیوی ہے۔ یہ اس کے بچے ہیں یہ اس کا گھر ہے۔ جب
وہ مر جائے گا تو پوچھو کہ یہ گھر کس کا ہے؟ بیوی کس کی ہے؟ یہ بچے کس کے ہیں؟ تو وہ جواب
دیتا ہے کہ سب کچھ خالق کا ہے۔ اور اگر مکان اس کا ہوتا، بیوی اس کی ہوتی، بچے اس
کے ہوتے تو کوئی شے اس کا ساتھ کیوں نہ دیتی۔ تو گویا نہ مکان اس کا ہے، نہ بیوی اس کی
نہ بچے اس کے ہیں۔ بلکہ کبھی وہ اس مکان کا تھا، کبھی وہ اس بیوی کا تھا اور کبھی وہ
ان بچوں کا تھا۔ بس ان گول مول واقعات سے مجھے پتہ نہیں چلتا کہ باپ کون ہے، بچے کس کے

گھر کس کا، گھر والا کون ہے؟

ایک عورت ہے وہ میکے میں بیٹی، سسرال میں بیوی اور ننہال میں نواسی ہے۔ وہی کسی کی بیٹی، کسی کی بہن، کسی کی بہو، کسی کی ماں۔ بس وہی بیٹی اور وہی ماں سب گول مول۔

کسان سے پوچھو کیا کر رہے ہو؟ کہتا ہے دانے زمین پر بکھیر رہا ہوں۔ چھ سات مہینے کے بعد پھر جا کے اسی سے پوچھو کہ بھئی کیا کر رہے ہو؟ جی دانے زمین پر سے اکٹھے کر رہا ہوں۔ وہی آدمی وہی دانے کبھی گھر سے لیجا کر کھیت میں بکھیرتا ہے اور کبھی کھیت سے اکٹھے کر کے گھر لیجاتا ہے۔ بس یہ سب گول مول ہے۔

کنجڑے سے پوچھو تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کہتا ہے جی انڈا ہے۔ پوچھو انڈا کہاں سے آیا ہے؟ جی مرغی نے دیا ہے۔ بھئی مرغی کہاں سے آئی ہے؟ جی انڈے میں سے نکلی ہے۔ بس انڈا مرغی میں سے نکلا ہے اور مرغی انڈے میں سے نکلی ہے۔ نہ معلوم مرغی نے انڈا دیا ہے کہ انڈے نے مرغی دی ہے۔ سب گول مول ہے۔

محلے میں پوچھو یہ کیا ہو رہا ہے؟ جی بینڈ بج رہا ہے۔ بھئی وہ کیوں؟ جی حمزہ پیدا ہوا ہے۔ کبھی پھر پوچھو کہ بھئی بینڈ کیوں بج رہا ہے؟ جی حمزہ کی شادی ہے۔ کبھی پھر پوچھو کہ بھئی آج بینڈ کیوں بج رہا ہے؟ جی حمزہ مر گیا ہے۔ بس حمزہ پیدا ہوا تو بینڈ بجا، پھر حمزہ کی شادی ہوئی تو بھی بینڈ بجا، اب حمزہ مر گیا ہے تو بھی وہی بینڈ بج رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب دنیا اس بینڈ کے گرد گول چکر میں گھوم رہی ہے۔ بجاؤ یہ بینڈ پیدائش اور موت کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے۔ سورج گول، چاند گول، آنکھیں گول مول، منہ گول، بازو گول، صراحی گول، پیالہ گول، میز گول، دل گول، زمین گول، سب گول مول۔

سورج اور چاند کیسے نظر آتے ہیں؟ جی آنکھوں کی مدد سے۔ اور آنکھوں میں روشنی کہاں سے آتی ہے؟ جی سورج اور چاند کی روشنی سے۔ آنکھیں ہیں تو چاند اور سورج نظر آتے ہیں۔ سورج اور چاند ہوں تو آنکھوں میں دیکھنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ بس سب گول مول۔

بدن میں خون تو چہرہ روشن، معشوق حسین۔ بدن میں خون تو دل قوی، عاشق شوقین۔ وہی خون معشوق میں حسن، اور وہی خون عاشق میں عشق۔ سب گول مول۔

بھئی مخلوق کس کی ہے؟ جی خالق کی۔ بھئی خالق کہاں ہے؟ جی مخلوق میں۔ بھئی مخلوق کہاں ہے؟ جی خالق میں۔ نہ معلوم خالق میں خلقت ہے کہ خلقت میں خالق۔ سب گول مول۔

میں کہتا ہوں صاحب! تم بھی گول مول ہو۔ اگر تم سیدھے سادے ہوتے تو تمہیں کبھی علم تک نہ ہوتا کہ میں گول مول لکھتا ہوں۔

(۳)

اُس کے نام جس نے لفظِ اُلفت کو بھی سمجھ کے رسوا کیا۔۔۔ جس
نے کسی کے انتظار میں کبھی اختر شماری نہ کی۔۔۔ جس
نے کبھی بھولے سے بھی دل دیکر اس کا نتیجہ نہ
دیکھا۔۔۔ جس نے ہوس پرستی، دوستی اور
خاص محبت کے باہمی فرق کو کبھی نہ
پہچانا۔۔۔ جس نے یونیورسٹی کے
نصاب کو تو چاٹا مگر کتابِ عشق
کی کبھی ورق
گردانی نہ
کی

پیارے ولسن !

کالج کے لڑکوں نے دوست کے لفظ کو دل کھول کے رسوا کیا ہوا ہے کبھی کبھی ان سے گفتگو کرو تو سنو گے کہ جی ملک شاپ والا سنتا میرا گہرا دوست ہے ٹک سٹال والا گیان سنگھ میرا پرانا دوست ہے اور تمہارا ن اسٹیشن والا نور قلی میرا سچا دوست ہے۔ گویا ہر سکنڈ ہر دم سے لے کر ایک مہینہ تک پیدا ہونے والے تعلقات ہیلو پیٹر کے دوست ہیں۔ اور ان سے پوچھو کہ کیوں صاحب تم بھی کسی کے دوست ہو تو ہیلو مسٹر کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ منہ چھپا لیں گے شرفاء ہیں کہ جی مطلب کی سب دنیا داری بس ہیلو پیٹر آئی ایم سوری کو یوں ادا کریں گے کہ گویا ان سین کے اکلوتے نواسے یہی ہیں بس معمولی سی آزمائش ہیں ان کی دوستی کی گہرائیاں محض سطحی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ولسن ! اب تم گریجویٹ ہونے والے ہو اور ابھی تک تمہیں معمولی معمولی الفاظ کے مفہوم میں تمیز کرنا نہیں آتا۔ جب کبھی تمہارا خط پہنچتا ہے تو یہی توقع ہوتی ہے کہ اب کے میرے ولسن نے ادبی قابلیت کا کچھ نہ کچھ ثبوت دیا ہوگا۔ مگر ہر دفعہ تمہاری تحریر میری پشیمانی کا باعث بن جاتی ہے۔ ایکبار میں نے تم سے پوچھا تھا کہ سٹوڈنٹ سے تمہارا برتاؤ کیسا ہے؟ اور تم نے سوائے ناک چڑھانے کے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اب تم یقیناً منتظر ہو کہ سٹوڈنٹ تمہیں جان سے بھی عزیز ہے۔ تمہاری محبت بھی گویا موسمی ہے جو موسم کے ہیر پھیر کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ولسن ! آدمی کو چاہیے اپنی زندگی کو چند اصولوں کا پابند کرے۔ یاد رکھو دوستی خریدی نہیں جا سکتی بذاتِ خود پیدا ہوا کرتی ہے۔ جس طرح محبت ایک قدرتی جذبہ ہے اسی طرح دوستی قدرتی یگانگی کا نام ہے۔ عشق اور دوستی میں فرق فقط یہ ہوتا ہے کہ عشق میں دل دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے یعنی جذبات اس قدر شدید ہو جاتے ہیں کہ خیالات کو ان کے تابع ہونا پڑتا ہے ان جذبات کو زندہ رکھنے کی خاطر غیر شعوری طور پر دل حسن کی قربانگاہ پر انفرادی مفاد کو بھینٹ دیتا ہے۔

خود غرضی کا فور ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس دوستی میں دماغ دل پر حاوی رہتا ہے۔ محبت نفسانی عمل ہے دوستی روحانی محبت میں جمالی شعاعیں حبیب کے دل کو یوں اکسانی ہیں کہ اس کے دل کے متاثر ہو چکنے کی حالت میں اس میں ایک نہ رکنے والی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس میں محبوب کا نقش ثبت ہو جاتا ہے۔ اس تحریک میں دماغ مجہول ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات دل کے ساتھ دماغی ذرات بھی متاثر ہو جاتے ہیں ایسی حالت میں یہ حرکت غیر ارادی ہو جاتی ہے اور دل و دماغ کی اجتماعی گرمی اس فرد کے دل میں گھر کر جاتی ہے۔ چنانچہ محبت عام نہیں رہ جاتی بلکہ خاص ہو جاتی ہے۔ یہ خاص محبت دائمی ہوتی ہے۔ اس کی تمثیل رانجھا ہیر کی محبت پیش کرتی ہے۔ من کی اس حالت میں عابد کے نزدیک ایک معبود کے سوا کوئی شے اس قدر دلکش نہیں رہ جاتی جو اس کے دل میں پھر ایسی حرکت پیدا کر سکے۔ بس عابد و معبود کا ساجھا فطری ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں عابد و معبود کے درمیان ایک ایسا اتصال ہو جاتا ہے جس کا عمل غیر شعوری طور پر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے افراد کو اس موجودہ وجود میں وصل نصیب نہ ہو سکے تو ان کے مر جانے پر ان کے من کے روشن ذرات ایک ہو جاتے ہیں لیکن اگر کسی فرد کی جمالی شعاعیں دوسرے دل کو اس قدر متاثر نہ کر سکیں کہ اس کے دماغی ذرات بھی مجہول ہو کر برابر متاثر ہو سکیں تو وہ حرکت محض دل تک محدود رہ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں معبود کا اثر من اور دماغ تک نہیں پہنچنے پاتا۔ چنانچہ معمولی معمولی اختلافات کی بنا پر نقشِ معبود عابد کے دل میں مدھم پڑ جاتا ہے۔ اس عمل سے عابد کے دل کی سمیں ہمیشہ کے لئے ناقص ہو جاتی ہے۔ اور پھر کبھی کسی اور کبھی کسی حسین کی جمالی شعاعیں ایسے عابد کو لمحاتی طور پہ مضطرب کرنے لگتی ہیں۔ ایسے دل پھینک عابد آج کل کالجوں میں عام ہیں۔

دل کا خاصہ قربانی اور ایثار ہے، دماغ کا خود پرستی۔ دل کا رجحان جمال کی طرف ہوتا ہے، دماغ کا نیک خصال کی طرف۔ دل کو سونا پارس بناتا ہے دماغ کو علم۔

دل تحلیل ہونا چاہتا ہے، دماغ تخلیق کرنا۔ محبت کا مسکن دل ہے، دوستی کا دماغ۔ صحت کی خرابی، ماحول کی تبدیلی اور دنیاوی لین دین عام محبت کو کم کر سکتے ہیں مگر دوستی کو نہیں۔ دوستی عام محبت سے پاکیزہ تر ہوتی ہے اور خاص محبت پاکیزہ و پختہ ترین۔ عام محبت کا ہر گز لطف اور حظ اٹھانا ہوتا ہے، دوستی کا سکھ اور خاص محبت کا آنند۔ عام محبت ہنساتی، دوستی مسکاتی اور خاص محبت مخمور کرتی ہے۔ عام محبت میں دل کی کامرانی ہوتی ہے، دوستی میں دل و دماغ کی جمہوریت اور خاص محبت میں من کی حکمرانی۔ عام محبت جوانانہ، دوستی مختصرانہ اور خاص محبت معصومانہ انداز رکھتی ہے۔ عام محبت فرشی، دوستی فرشی و عرشی اور خاص محبت عرشی ہوتی ہے۔

ان تینوں سے ادنیٰ درجہ ہوتا ہے واقفیت کا جو ذرا بڑھ جائے تو رفاقت کہلاتی ہے۔ واقفیت سماجی زندگی کی روح رواں ہوتی ہے۔ یہ ہر جگہ اور ہر وقت ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ اس کا دار و مدار دنیاوی لین دین پر ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد عموماً غرض ہوتی ہے۔ یہ گویا ہستئ انسانی کی مشاطہ ہے۔ اس کا تنگ ترین دائرہ برادری اور فراخ ترین قومیت ہے۔ یہ بہن بھائی، میاں بیوی اور شاہ و گدا تک گذر رکھتی ہے۔

واقفیت، عام محبت، دوستی اور خاص محبت میں سے کسی کا بھی راستہ مذہب کا سجھوتہ نہیں روک سکتا۔ البتہ واقفیت اور عام محبت آدمیت کے دائرہ میں مقید رہتی ہیں۔ دوستی آدمیت اور انسانیت کی حدود کو ملحق کرتی ہے۔ مگر خاص محبت کا گزر آدمیت کے دائرہ میں ممکن نہیں۔ یہ انسانیت کی ملکہ ہے۔ عام محبت اچھے اور کمینے بھی کر گزرتے ہیں مگر دوستی فقط

نوٹ :- ۱۔ جو شہوت تک محدود ہو۔

۲۔ جس کا سمبندھ دنیاوی لین دین سے بھی ہو اور روحانی بھی۔

۳۔ جو دنیا دنیا کے جھمیلوں سے بالکل بالاتر ہو۔

دو اعلیٰ دماغوں اور دو صاف دلوں کے درمیان ممکن ہے۔ خاص محبت اعلیٰ ترین دماغوں اور صاف ترین دلوں کے باہمی اختلاط کا نام ہے۔ واقفیت کا ماخذ احتیاج، عام محبت کا جمالی کشش، دوستی کا ہم خیالی اور خاص محبت کا تجلی ضمیر ہے۔ واقفیت تکلف چاہتی ہے، اس میں ایک دوسرے کے احسانات کا شمار ہوتا ہے اس کا تکیہ کلام ہوتا ہے، "پہلے آپ"۔ عام محبت رسوائے عام سے ڈرتی ہے۔ یہ جلوت میں لومڑی اور خلوت میں شیر ببر ہوتی ہے۔ عام محبت کی غذا چہرے کی ہوس، اس کا مسکن سینے کا ابھار۔ یہ ہوتا ہی گرم نبض کی تیزی، سانس کی سرعت، نظر کی شوخی، ہونٹ کی کج ادا اور سراپا کی نقلی ہوتی ہے۔ عام محبت کرنے والے کا وقت انتظار میں کٹ جاتا ہے، دوست کا تیمار داری میں، اور خاص محبت کرنے والے کا تصور میں۔ واقفیت چائے سگریٹ پیش کرتی ہے، عام محبت دل کے پرزے پیش کرتی، دوستی دل اور خاص محبت دل و دماغ کی معجون۔

دیکھو لیسن! جس طرح محبت اور دوستی میں فرق ہوتا ہے اسی طرح دوستی اور رشتہ داری بھی دو مختلف جذبات ہیں۔ جس طرح محبت اور دوستی میں چند اتحادی عناصر پائے جاتے ہیں اسی طرح دوستی اور رشتہ داری میں بھی سمجھا ہوتا ہے۔ رشتہ داری سماجی جذبہ ہے دوستی انفرادی۔ رشتہ داری کا حلقہ دوستی کے حلقے سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ رشتہ دار سینکڑوں ہو سکتے ہیں مگر دوست فقط ایک یا دو۔ واقفیت کروڑوں سے ہو سکتی ہے مگر خاص محبت ایک کی ایک کے ساتھ۔ رشتہ داری مادی اور شخص یگانگی سے شروع ہو کر گرمیت کی ارتقائی منزلوں سے گزر کر مامتا کی بلندی تک پہنچ جاتی ہے۔ عام محبت کا انجام بے دلی، دوستی کا ہمدردی اور خاص محبت کا ایثار۔ ان میں بعض ایسے رشتہ دار ہوتے ہیں، بعض دوست اور بعض رشتہ دار دوست۔ رشتہ دار اور عام محبت کرنے والے کے درمیان رشتہ دار دوست کا درجہ ہوتا ہے۔ اب تم ہی کہو لیسن! اس وقت سے تمہاری واقفیت ہے، رشتہ داری ہے، عام محبت ہے، رشتہ دارانہ دوستی ہے، دوستی یا خاص محبت ہے؟

جواب کا منتظر

(۱۶)

اُس کے نام جس کی سب خوشیاں شادی کی لاٹری نے چھین
لیں.... جس کے مستقبل پر سانپ نے
نراشا کے چھینٹے
دیئے

ہلدم!

تمھیں تو جنون ہو گیا ہے۔ آئے دن وہی رونا روتے رہتے ہو۔ ایک بار نہیں ہزار مرتبہ سمجھایا ہے کہ تمھاری بربادی میں تمھارے والد ماجد کا کوئی خاص قصور نہیں۔ یہ سب کام سماج کی برکت سے ہوا ہے۔ لڑکے کا وجود ابھی باپ کے دماغ میں ہوتا ہے اور اس کی سگائی کے وعدے پختہ ہو جاتے ہیں۔ تم دیدہ دانستہ نادان بن جاؤ تو کیسے سمجھاؤں۔ یہ ہمارے تمدن کا جوتا ہے جسے غلطی سے تم اپنے باپ کے پاؤں میں دیکھ رہے ہو۔ کون نہیں جانتا لاکھوں جوانیاں آئے دن برباد ہو رہی ہیں اور بیجا خوشی کے پیالے شری عمر بھر کی تمنا کا خون کر دیتی ہے جس کی روک تھام کوئی معمولی کام نہیں۔ صدیوں کی بیماری کا سدباب ہمارے والدین کے بس کی بات نہیں۔ اور کچھ تم ایسے ہی ہو راگ۔

۵۔ زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

حور کے پہلو میں لنگور خدا کی قدرت

ہرگز پسند نہیں آتے جس پہلو سے تم مسئلہ شادی کو حل کرنا چاہتے ہو اس پہلو سے تو یہی شادی قانونِ قدرت کے عین برعکس ہے۔ حوا اور آدم کی رسومات شادی کیسی نے ادا کی تھیں جو ان پر کوئی شرع عائد کی گئی تھی۔ یوں تو یہی شادی واقعی جیسا وہم ہے جوں ہی شادی کا طوق گلے میں پڑا جذبِ محبت کافور ہو گیا اور فقط فرض شناسی رہ گئی۔ وہی نوجوان جو پروانہ وار اپنی شمعِ زندگی کے گرد صدقے ہوا چاہتا ہے، شادی کے دوسرے ہی دن اپنی دوشیزہ کو دائمی زنجیر محسوس کرنے لگتا ہے، اور خوشی کی بجائے عمر بھر کے سودا کی فکر اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ نر و مادہ کا ساتھ تو ضرور قدرتی ہے مگر یہ ساتھ اندھا دھند نہیں ہونا چاہیئے۔ انسان حیوان نہیں جو محض شہوت کی آگ بجھانے کی خاطر مادہ سے وصل کر گزرے۔ وہ انسان ہے، اس میں شعور ہے جو اس کو اس کی بس کے دائرہ

لباور سنرا واجب آیا ہے۔ یا اس کو سماج کی قدیمی سینہ زوری اور اپنے والد بزرگوار کی سادہ لوحی کی سزا جان لو۔ اور ہمیشہ یوں خیال کرو کہ وہ ذی روح نہ تمہاری بھاشا سمجھتی ہے نہ تمہاری طرز روش زندگی سے واقف ہے۔ اور جسے تم اس کی حالت پر بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ بلکہ اسے فراغت میں تھوڑا بہت سدھانا چاہئیے۔ ہوسکتا ہے وہ تمہاری راحت تو نہ بن سکے مگر کہیں تمہاری راہ میں ٹھوکر بن کر بھی نہ رہ جائے۔

باقی رہا تمہارا نروان حاصل کرنے کا سوال۔ بھارتی فلسفیوں نے اس کے دو راستے بتلائے ہیں۔ ایک تو یہ شاہراہ دین پر چل کر باقاعدہ شرع کو ماننا، شادی کرنا اور غیرفانی ہونا۔ دوسرے شاہراہ شعور پر چل کر گیان حاصل کرنا اور غیرفانی ہونا۔ جہاں تک تو اولاد کی تخلیق کے ذریعے نروان حاصل کرنا ہے اس پر تو کبھی پھر غور کریں گے۔ ہاں دوسرے شعار پر چل کر تم بھی آواگون سے چھوٹ سکتے ہو۔

مجھ سے ہرگز یہ امید نہ رکھو ہمدم! کہ میں بھی دنیا داروں کی طرح کہدوں کہ جیسے کٹتی ہے کٹنے دو۔ میں تو صاف کہوں گا کہ تمہیں خوشی سے جینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ زندگی کے اتفاقات نے چاہا تو تمہیں کبھی نہ کبھی ظاہری و باطنی خوشی حاصل ہوجائے گی۔

آمین

(۴)
اُن بچپن کے ساتھی کے نام جس کی باتیں کبھی جادو کا اثر رکھتی تھیں...
جس کے ہمراہ آوارہ گردی کبھی سفرِ حجاز سے کچھ کم
نہ ہوتی تھی ...... جس کی آواز فردوسِ
گوش اور صورت جنّت
نگاہ
تھی

جیتندر! چھوڑو پرانی باتیں۔ مجھے اب سمجھ آگئی ہے کہ وہ سب تمہاری موجودگی کی وجہ سے ہی تھا جو مجھے پھول سہانے لگتے تھے۔ اب میں نے بہترین پھلواڑیاں دیکھی ہیں مگر وہ مجھے قطعاً خوش نہیں کر سکیں۔ ان میں کہیں نام کو بھی وہ سہانا رنگ نہیں، نہ کہیں تو وہ دیوانہ بنا دینے والی سگندھ ہی باقی ہے۔ زعفرانِ کشمیر کی تعریفوں کے شاعروں نے پل باندھے ہیں مگر تمہارے بغیر سب بےرنگ دکھائی دیتے ہیں۔

پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ دنیا کا ہر مریض باغ میں جا کر صحتیاب ہو سکتا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اکسیری اور کے نقشِ قدم میں مخفی ہے۔ کبھی میں خیال کیا کرتا تھا کہ اگر چمن کی تراشِ خراشِ غم غلط نہ کر سکے تو گلِ صحرا کے نظارے تو ضرور دل کو زندہ کر دیں گے۔ اب میں نے نخلستانوں کی بھی دل بھر کے سیر کر دیکھی ہے۔ جہاں سے تمہارا کبھی گزر نہیں ہوا اس جنگل کے پھول تو مجھے بچھو کی طرح کاٹتے ہیں۔ ان دنوں انہیں بادِ صبا اٹھلا اٹھلا کر گدگدایا کرتی تھی۔ اب انہیں سموم جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر باؤلا کر رہی ہے۔ جن داؤدیوں پر ہم ہنسا کرتے تھے ان کی اب گیندے سے جھنک ہے جونہی میں ان کی جانب بڑھتا ہوں تو یہ منہ موڑ لیتی ہیں۔

جیتندر! کل میری آنکھوں میں درد تھا۔ میں کھیتوں کی سیر کو جا نکلا۔ تو سن میں بے انتہا پھول کھلے تھے۔ میں نے وہاں سستانا چاہا مگر انہوں نے اس قدر بےرخی ظاہر کی کہ میں کھسیانا ہو کر وہاں سے چل دیا۔

جیتندر! یاد ہے تمہیں وہ لیموں جس کے گرد ہم بار ہا چکر لگایا کرتے تھے۔ تم اس کے نیچے چھپا کرتے تھے، میں پتوں میں سے اپنے رشتۂ نظر سے تمہیں باندھا کرتا تھا۔ تم فرشی چلایا کرتے تھے اور پوڑھا سان آکے مجھ کو ساکتا تھا۔ کل لیموں نے مجھے دیکھ کے پھول تو غنچوں میں بند کر لئے اور کنڈ یا لیے کی مانند سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تم وہاں مجھے یاد آئے۔ تم میرے ساتھ ہوتے تو یہ لیموں کی ہم جیتروں سے

وہی گت بناتے جو ہم نے راکھی کے دن بنائی تھی۔

چترس پیارے! پہلے کی طرح سب کھاڑیوں پہ پھول آ گئے ہیں۔ اُن دِنوں میں ان کی بے حد عزت کیا کرتا تھا اور تمھیں بھی کہا کرتا تھا کہ ان پر پاؤں مت دھرنا۔ اب میں خود انھیں روندتا جاتا ہوں۔ نہ معلوم ان میں وہ کشش کیوں نہیں رہی جو تمہارے ساتھ گھومتے وقت میرے دل کو نرمایا کرتی تھی۔ تم اِن تبدیلیوں کی وجہ میرے من کی تبدیلی ٹھہراؤگے مگر ایسا نہیں چترس! پھولوں کی وہ رنگینیاں، ہوا کی وہ اٹکھیلیاں، سبزے کا لہلانا جب ہی جاذبِ نظر ہوتا تھا جب تم ان پر جلوہ فگن ہوتے تھے میری بصیرت اُن دنوں اتنی خام تھی جو اتنی تمیز بھی نہ کر سکی کہ پھولوں کی رعنائیاں مستعار تھیں یا سدا بہار۔

چترس! کبھی آؤ نا۔ دیکھنا کہیں میرے زخم ہائے جگر لاعلاج نہ ہو جائیں۔ انھیں اب مناظرِ فطرت درست نہیں کر سکتے۔

درشن پیاسا

(۵)

اُس گمراہ عزیز کے نام جس نے کبھی کچھ نہ سمجھا۔۔۔ جو اگلے اور آجکل
کے استادوں میں بھی تمیز نہ کرسکا۔۔۔ جس نے شخصی بندگی
میں عقیدت رکھنے کو عبث قرار دیا۔۔۔ جس
پر حقیقی تعلیم کی چھینٹ تک نہ
پڑنے پائی۔۔۔ جو
اتنا بھی نہ
سمجھا کہ
استاد
افسر
نہیں
ہوتا،
رہنما
ہوتا ہے

دیپان !

وہ قوم جو اپنے بزرگوں کا ادب، اپنے نوجوانوں کی قدر اور اپنے بچوں
سے پیار نہیں کرتی وہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں دنیا کی نظروں میں خوار ہو جائے گی
یہ تو تم سچ کہتے ہو کہ ہمارے استاد شاگرد کو ہمیشہ اپنے سے قابل بنا کے فخر کیا کرتے
تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مرنے کے بعد ان کے خیالات، ان کے ارادے اور ان کی تمنائیں
ان کے شاگردوں کے ذریعے باقی رہ جاتی ہیں اور اس طرح ان کی ارتقائی منازل طے ہوتی
جاتی ہیں۔ مگر تم یہ بھی نہ بھولو دیپان! کہ اچھے شاگرد بھی اس پیاسے کی طرح جو چشمے پر اس
تاک میں بیٹھا رہتا ہے کہ چشمہ پھوار چھوڑے وہ اپنی پیاس بجھائے، یا اس سارنگ کی طرح
جو آکاش کی بوند کی انتظار میں فرشی تلچھٹ کا پینا قبول نہیں کرتا، سخت پیاس برداشت کر لیتا ہے
اپنے استاد کی نصیحت پر کان دھرے رہتے تھے۔ وہ سچے دل سے اپنے استاد کی خدمت
کرتے تھے اور استاد و شاگرد کے سمبندھ کو استوار مانتے تھے۔ مگر افسوس آج کا
کولیجین جماعت کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی خیال کرتا ہے کہ کھیل شروع
ہونے سے پہلے سینما ہال میں اپنی نشست بہتر سے بہتر تلاش کرے وہ من ہی من میں اتراتا
ہے کہ اسے ایسی نشست مل گئی ہے جہاں بیٹھے نہ ایکٹر کی آنکھ اس تک پہنچے گی اور نہ
اس کے کانوں کو ایکٹر کی آواز سننے کی زحمت اٹھانی ہوگی۔ وہ خوش خصال ادھر ادھر
نظر دوڑاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ آیا اس کے آس پاس کوئی اور بھی تماش بین اس کا ہمراز
ہے کہ نہیں؟ اس کی غیر شعوری خوشی اس بات پر بھی ہوتی ہے کہ اس نے سامنے بیٹھنے کا
ٹکٹ ایک دام خرید لیا ہے۔ وہ کئی بار مقابلتاً قیاس کرتا ہے کہ ٹاکیز میں داخل ہونے
کے لئے ہر روز کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور جب کبھی ٹکٹ حاصل ہوتا ہے مگر ڈی کا ... میں
تو فوراً ایک دن ... دیکھنی پڑتی ہے اور سارے مہینے کی دل لگی کا سامان مہیا ہو جاتا
تم ٹھیک کہتے ہو دیپان! مگر آج کا استاد جماعت کے کمرے میں داخل

ہونے سے پہلے اپنے لباس کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر ایک عجیب انداز سے اپنے شانوں کو حرکت دیتا ہے جیسے کوئی پیلتن پہلوان اکھاڑے میں قدم بڑھانے کو ہے اور کبھی اپنے پرچھائیں میں اپنی دستار یا مانگ کے ابھار کا مشاہدہ کرتا ہے، پھر ایک ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ درست کرتا ہے اور دوسرے سے پتلون کی کریز بناتا ہے، کبھی یونیورسٹی کے نصاب کے کسی حصے کی رٹی ہوئی تشریح کا اعادہ کرتا ہے، من ہی من میں دعا مانگتا ہے کہ رب رحم کرے کہیں اس کا رعب نہ جاتا رہے۔ وہ اپنے متعلقوں کا اعلیٰ افسر تصور کرتا ہے۔ وہ ہر حال میں انھیں دبانا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کسی مسئلے پر بحث چھڑ جائے۔ اسے اچھی طرح یقین ہوتا ہے کہ اگر کسی قابل طالب علم نے ایک دو سوال پوچھ لئے تو اس کی لیاقت کا بھرم کھل جائے گا۔ حقیقت میں یہ [illegible] استاد احساس کمتری کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ گھل گھل کر مر جاتا ہے مگر اپنے پیشہ کی تبدیلی گوارا نہیں کرتا۔ کرے بھی کیا اس نے داموں سے علم خریدا ہے۔ اب اسے بیچ کے خسارہ پورا کرے تو بیوپار کو دستکاری سیکھنا ہوگی۔ وہ ہٹ دھرم نہیں جانتا کہ وہ استاد ہے افسر نہیں۔ وہ رہنما ہے حاکم نہیں۔ اس کا کام افسری کرنا نہیں بلکہ بچوں کو افسری کے قابل بنانا ہے۔ اسے خواہ مخواہ رعب نہیں جمانا ہوتا، شاگردوں کے دلوں میں اپنا گھر بنانا ہوتا ہے۔ اس کی شان اس بات میں نہیں کہ اس سے شاگرد ڈریں، اسے فخر اس بات میں ہونا چاہئے کہ اس کے شاگرد سچے جوش سے ہدیہ دل پیش کریں۔ کاش وہ جانتا کہ جہاں ڈر ہوتا ہے محبت نہیں رہتی اور ادب فقط نیک خواہی کا اثر ہوتا ہے۔ اِدھر یہ استاد بڑی تمکنت میں اسٹیج پر آتا ہے اور ادھر شاگرد بھی [illegible] جگہیں ریزرو کر رکھی ہیں۔ استاد کی کوشش ہوتی ہے کہ شاگردوں پر افسرانہ رعب رکھا جائے اور شاگردوں کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کہیں یہ کوتاہ نظر استاد رعب جمانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ وہ انھیں منڈی کی خرید خیال کرتا ہے اور وہ اس کو

اپنی خوشیوں کا قاتل تصور کرتے ہیں۔ وہ انھیں کوئی کام کی چیز بتا کے خوش نہیں اور وہ اُسے
خوش کر کے اس سے کچھ سیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ اِدھر اُستاد کی ایک آنکھ کلائی کی گھڑی پر
ہوتی ہے اور اُدھر شاگردوں کے کان کالج کی گھنٹی کی طرف لگے رہتے ہیں۔ بیچاروں
کے فرش پر پاؤں اس سے بوٹ گھس جاتے ہیں چنانچہ ہر ہفتے نئے نعل بندھوانے
پڑتے ہیں۔ اماں باوا نے تو گھر کے اثاثے سے ہاتھ دھو کر فیس ادا کی ہوتی ہے اور
یہ سعادت مند شہزادگی کی ہواؤں میں رہتے ہیں سال کے بعد کھیل ختم ہو جاتا ہے وہ کسی اور
مال کی تلاش میں نکلتے ہیں اور یہ اپنی تنگ سحری کی آزمائش میں ایک نئے گروہ کو تختۂ
مشق بناتا ہے۔ نہ وہ صاحبزادے سمجھتے ہیں کہ یوں اُن کی انمول عمر اکارت جائے گی۔ اور
نہ وہ سقراط کا بیٹا اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ وہ اُستادی کے شایاں نہیں۔ اس کے
لئے بہتر تو یہ ہے کہ کسی سرکس میں جگہ تلاش کرے مگر اس کے برعکس وہ محض اپنی پوزیشن
برقرار رکھنے کی خاطر کئی حیلے اختراع کرتا ہے کبھی پرنسپل کے جوتے چاٹتا ہے اور کبھی کالج
کی کمیٹی کے ارکان کے بدولوں کو پانی دیتا ہے مگر اس نے حلف اٹھا رکھا ہے کہ اُستاد
کے معزز پیشے کو بدنام کر کے ہی مرنا ہے۔

ہاں دیہان! تمہارا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ اُستاد جس کو قدرت نے اُستاد
بننے کے لئے پیدا کیا ہوتا ہے شاگردوں کی خامیوں کو دیکھ کر طیش میں نہیں آتا۔ وہ خوب
جانتا ہے کہ اس کے آگے زانوئے ادب طے کرنے ہی وہ آتے ہیں جنہوں نے اپنے تئیں
خام مانا ہوتا ہے۔ ورنہ کیا پڑی ہے کہ وہ صبح صبح کے سہانے بارش ہو یا آندھی چلے کالج
کو دوڑے آئیں۔ ہاں کامل اُستاد کبھی کبھار کسی شوخ شاگرد کو غیرت دلانے کے لئے
جھڑک دیتا ہے مگر اس کے دل میں شاگرد کے لئے دائمی کدورت نہیں ہونے پاتی۔ وہ تو
ابرِ کرم ہے کھلائی طور پر کریں گے ہر شاگرد کی حوصلہ افزائی کئے دیتا ہے۔ وہ اچھی طرح
جانتا ہے کہ ہر روز اُستاد کے سامنے آنا ہی سخت سزا سے کم نہیں۔ کامل اُستاد ایک

انتہا پسند ہے جس کے دل کی گہرائیوں تک کوئی نفسیاتی مرض نہیں پہنچنے پاتا۔ اس کی آواز آوازِ قدرت ہوتی ہے وہ تنخواہ کی خاطر پڑھانے نہیں جاتا بلکہ شمعِ علم کو روشن کرکے جہالت کے جراثیم جلاتا اور نسلِ آدم کو انسان بناتا ہے۔ نہ اس کی اپنی کوئی خواہش ہوتی ہے نہ پسند۔ اس کی عزت و توہین قومی بچوں کی ترقی و تنزل ہی ہوتی ہیں۔ اس کا ہر قدم انسانی بھلائی کی جانب اٹھتا ہے۔ وہ جیون مکت ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی روح قوم کی اجتماعی ضمیر کا ایک جزوِ لازمی بن جاتی ہے۔

اب تم ہی کہو دیبیان! کیا سچی تعلیم براڈکاسٹ کے ذریعے کبھی دی جا سکتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تعلیم کا مقصد محض یونیورسٹی کی سند حاصل کر لینا ہے جہاں تک یونیورسٹی سند کا تعلق ہے وہ تو بھلا ذہین طالب علم پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے حاصل کر سکتا ہے، مگر اعلیٰ تعلیم کا اصل مقصد آدمی سے انسان اور حیوانِ ناطق سے شہری بنانا ہوتا ہے۔ ورنہ سند یافتہ دو پائے تو لاکھوں کی تعداد میں پھرتے ہیں جو انسانیت کے مفہوم تک کو نہیں سمجھتے۔ کالج کی تعلیم ہنر کی سیکھ پانے کی غرض سے نہیں ہوتی۔ کالجوں میں اعلیٰ مضامین پڑھائے جاتے ہیں مثلاً فلسفہ، سیاسیات و اقتصادیات وغیرہ اور بعض اسکولی مضامین بھی اعلیٰ پیمانہ پر شروع کیے جاتے ہیں مثلاً لٹریچر، سائنس، تاریخ و ریاضی وغیرہ۔ اسکول میں بچہ زبان سیکھتا ہے اور کالج میں ادب۔ بعض نوجوان زبان کا صحیح استعمال جاننے کے باوجود بھی ادیب نہیں ہوتے، ان میں اہلیتِ تخلیق بھی ہوتی ہے یعنی ان میں ادبی عناصر بھی سب موجود ہوتے ہیں مگر ان عناصر کو متحرک کرنے والا انہیں کوئی نہیں ملتا۔ جن کالجوں میں کوئی کامل استاد ہوتا ہے جونہی ایسا طالب علم جس میں ادبی عناصر موجود ہوتے ہیں ایسے استاد کی نظر میں آتا ہے ذرہ ستارہ بن جاتا ہے۔ جونہی وہ کامل استاد کی کامل زندگی اور اپنی خام زندگی کے فرق کو پہچانتا ہے محض حیرت سے اس کی دماغی الجھنیں سب دور ہو جاتی ہیں اور جب یہ ہم بزم کا

عمل متواتر دو چار سال جاری رہتا ہے تو اس جوان کے دماغی ذرات اس قدر تبدیل ہو جاتے ہیں کہ وہ آدم زاد ہمیشہ انسان کی روش پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اب تم ہی کہو کہ یہ اثر جو محض شخصی ہے جسے قابل شاگرد کامل استاد کی نظر شفقت سے حاصل کرتا ہے تمہاری براڈکاسٹ کے ذریعے دی جانے والی تعلیم کیسے حاصل کر سکے گا؟ علاوہ ازیں کالج لائف تعمیر کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں متعلم کو کتب بینی کے ساتھ ساتھ جسمانی ریاضت بھی کرنی ہوتی ہے۔ اسے جو کچھ پڑھنا ہوتا ہے اسے انسانی زندگی کی کسوٹی پر پرکھنا بھی ہوتا ہے۔ یاد رکھو دیبان! یہ ایپیٹ تعلیم کلرک تو پیدا کر سکتی ہے مگر اچھا شہری نہیں بنا سکتی، اسی طرح براڈکاسٹ کے ذریعے سے دی جانے والی تعلیم نوجوان کو تجارتی لین دین میں تو ماہر بنانے کی مگر اسے انسان نہیں بنا سکتی۔

تو سمجھے دیبان! استادوں کے عیوب شمار کرنے سے پہلے اپنے من کا مطالعہ کر لیا کرو۔ ہر اتوار کو اکانت میں بیٹھ کے سوچا کرو کہ کہیں تمہاری اپنی برائیاں تو تمہیں گمراہ نہیں کر رہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ خوشحال گھرانوں کے کمینے بچوں کی طرح تم بھی ماہوار ادائیگی کو استاد کی مہربانیوں کا کافی صلہ خیال کرنے لگو۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کوئی بھی زر یا رقم کامل استاد کی خدمات کا صلہ ادا نہیں کر سکتی۔ دیبان! اگر تم کالج جاتے ہی من مار کر بیٹھو گے یا تم اپنے دل و دماغ کے دروازے پہلے ہی مقفل کر لیتے ہو تو بتاؤ ایسی حالت میں تم استاد سے کیا فیض پاؤ گے۔ جب تک تمہارا من حصول تعلیم کے لئے مضطر نہیں رہتا استاد کس طرح اس میں سبق ثبت کر سکتا ہے۔ جس طرح زمین کی تپش سے آکاش برستا ہے اسی طرح شاگرد سراپا تشنہ ہونا چاہئے جس کو دیکھتے ہی استاد بھی اپنا سبق رغبت سے کرے۔ اور وہ باریک ترین نکات کو بھی آسان انداز سے ادا کرے کہ شاگرد ان کو سمجھا [illegible] کر لینے پہلے کبھی نہ بھلا سکے۔

میں نہیں چاہتا کہ میرا دیپان ان لڑکوں میں سے ایک ہو جو استاد کو یوں ستاتے ہیں کہ ان کی منحوس صورتیں دیکھتے ہی استاد کے خیالات منتشر ہو جاتے ہیں۔ وہ شریف زادے نہ صرف خود برباد ہوتے ہیں بلکہ اپنے متعدی جراثیم سے کئی نیک خو نوجوانوں کو بھی برباد کر دیتے ہیں۔ ایشور تمہیں ایسے قبیح ساتھیوں سے کوسوں دور رکھے۔

دعاگو

(۶)

اُس کے نام جو فطرتاً ہٹ دھرم واقع ہوا۔۔۔ جس نے اپنے محبوب
کو بھی ٹھیک نہ سمجھا۔۔۔ جس نے دوسروں کو
ہمیشہ اپنی امارت کی عینک

سے

دیکھا

من موہن!

تم بے حیا عشق کی باتیں کرتے رہتے ہو۔ کیا ہم پر گزرتی ہے یہ ان
کی بلا جانے، خوب ہے۔

خدا کی قسم من موہن! میں جوانی میں ہی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں وہ
ناکام ہوں جس نے جد وجہد کے پسینے سے ناکامی کو سینچا ہے۔ میری عید بھی
محرم بنا ہے، میری دیپ مالا بھی تاریک۔ نہ میرا کوئی غم ہے نہ میری کوئی خوشی
خوشی! عالم شباب ہی میں میرے چہرے پر پیری کے آثار چھائے ہوئے
ہیں۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے صاف بتلا رہے ہیں کہ بینا نابینا ہے۔
میرا وہ سورج ڈوب گیا ہے جس کے عکس سے میری آنکھوں میں قوت بینائی پیدا
ہوا کرتی تھی۔ میں اس تختے کی طرح گھوم رہا ہوں جو کسی بڑے جہاز سے ٹوٹ
کر بادلوں کی متلاطم راتوں میں لہروں کے تھپیڑے کھاتا پھرتا ہے۔

تم کس قدر معصوم ہو من موہن! جو میری بے بسی کو بے باکی کہتے ہو۔
دکھ تو یہ ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری آباد دنیا کے آس پاس بعض بے رنگ
بستیاں بھی برباد ہو چکی ہیں، اور نہ میں ہی تمہیں اپنے من کی اصلی دنیا دکھانے
کی غلطی کر رہا ہوں۔ ڈر ہے کہیں میری برباد تمنائیں تمہیں عالم خواب میں میرے
آلام سے آگاہ نہ کر دیں۔ اگر وہ گھٹائیں جو میرے دل و دماغ کو تاریک کر رہی
ہیں اپنی طاقتیں تمہاری حسین بہاروں کو نچھاور کر دیں گی تو تمہیں اس پر سے گزرتے
پنچھی کی طرح پھر اپنی گرمی خاک بستر پر گلشن کی معطر فضا میں منہ کے بل دم
توڑ رہا ہے، تم سمجھ کر مرجھا جاؤ گے۔

تم بضد ہو رہے ہو کہ میں تمہارے پاس کیوں نہیں جاتا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں
اب بھی وہی ہوں جسے تم نے کبھی دیکھا تھا۔ انھیں کس طرح سمجھاؤں میری جان! کہ میرا
وہ جوبن کب کا ختم ہو چکا ہے۔ وقت کے سیلاب نے وہ وہ گل کھلائے ہیں کہ پرانی عمارت
کا کوئی بھی نشان باقی نہیں چھوڑا۔ اب ان کھنڈروں میں تمہارے سرکی کا چھوٹا سا باشی ہے
وہ دانت جنھیں تم موتیوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے لڑکھڑانے لگے ہیں۔ وہ قہقہے جو کبھی
سن رسیدہ استادوں کو گرما دیا کرتے تھے اب ٹھنڈے سانسوں کی سرسراہٹ
میں سرد پڑ گئے ہیں۔ میری کشادہ پیشانی جھریوں کی الجھن میں پھنس گئی ہے۔ اب تم
ہی کہو کس منہ سے تمہارے سامنے آؤں۔ تم اب مجھے نہیں پہچان سکو گے۔ اور پہچانو گے
تو ضرور پچھتاؤ گے!

اُس پتھر دل کے نام جو بے وفا ثابت ہوا...... جس نے دل پہ ہاتھ
رکھ رکھ کر وفاداری کی قسمیں کھائیں اور ہوائی جہازوں
کی ہوا کھا کے انہیں ہضم کر لیا..... جس نے
فرنگی کے تمغوں سے سینہ سجانے کو دیں
کی غلامی کی زنجیریں
کاٹنے پہ ترجیح دی.................. جس کی فوٹو کسی کے
دل کے البم میں ابھی
تک موجود
ہے

میرے پاس ہے تمہارا وہ خط جس میں ہماری پُر راز ایجادیں کام آئی
تھیں جس میں (آئینہ کی مدد سے پڑھئے!) کی ہدایت درج تھی ۔ وہ ایک پُر اسرار
ادب ہے جس کا نمونہ اہلِ عقل پیش نہیں کر سکتے، اس کی شرح فقط اہل دل ہی کی [illegible]
آتی ہے ۔ تم لندنی پرواز کے ذوق میں کھو گئے ہو ورنہ میری طرح اس اسکول کی
زیارت کرنا تمہارے لئے بھی سفرِ حجاز سے کم نہ ہوتا جہاں میں ہر سال از راہِ حج جایا
کرتا ہوں ۔ کیا بھول گئے وہ نامے جن کو چاک کرتے وقت میری گود گلاب کی پتیوں
سے بھرپور ہو جایا کرتی تھی ۔ کیا ہوئے تمہارے وہ لفاظی سے بھرپور دعوے! کیا
وہ پیہم کہانیاں نقل کی ہوئی تھیں تم نے! انہیں یوں کہنا میری زبان درازی
ہے پریتم! ان کے پڑھنے سے میرے دل کی کسک بیشک بڑھ جایا کرتی تھی ۔
تو یہی ناگوار ہوا ۔ پھر کیا نے اب تمہاری یاد داشت کمزور کر دی ہے
ذرا وہ وقت تو یاد کرو جب ہم میٹرک کا نتیجہ سن کے گھروں کو جا رہے تھے ۔
مجھے تو بالکل یاد ہے وہ شام کا دھندلکا ۔ وہ درخت جو سڑک کے کنارے کھڑا تھا ۔
اب بھی میرے سر پر چھا رہا ہے ۔ سب پیمانِ وفا تم بھول چکے ہو ۔ اپنے دل پر ہاتھ
رکھ کے کہو کیا میں نے تمہیں بھگوان کی شہادت دیتے ہوئے کہا نہیں تھا کہ
تمہارے اور میرے درمیان ایک اتھاہ سفر درپیش ہے ۔ ہمارے راستے مختلف
ہو جانے والے ہیں ۔ تمہارے خوابوں کی تعبیروں سے پتہ چلتا ہے کہ تمہیں ایک دن
ہوا میں اُڑنا پڑے گا ۔ اور میرے خوابوں کی تعبیریں صاف بتاتی ہیں کہ مجھے ایک
دن گدڑی پہننا ہو گی ۔ کیا میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ ہمیں ہمیشہ کے واسطے ایک
دوسرے کو بھلا دینا چاہیئے ۔ ابھی ہم بہارِ جوانی کی رنگینیوں سے بالکل بے بہرہ تھے ۔
وہ الھڑ زمانہ تھا ۔ ابھی ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے نقوش اَمٹ نہ ہونے
پائے تھے ۔ تم نے محض اپنے دل کا پاس رکھتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ جب

نوٹ:- ذیل کے شعر کو آئینہ کے سامنے رکھیں اور اس کا عکس پڑھیں تو صاف پڑھا جائیگا ۔

کوئی اور سنوار ہاتھ نہ آئے مجھے ہی سامان تفریح مان لینا چاہیے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور فرمایا تھا کہ تمہارے بغیر کیسے جی سکوں گا۔ درحقیقت یہ تمہاری دماغی چال تھی۔ میں نے کئی مرتبہ انکار کیا مگر بالآخر ہاتھ دینے کی لاج رکھنی واجب جان لی اور یہ کہتے ہوئے میں نے وفا کا ہاتھ دے دیا کہ اگر واقعی تم سچ کہہ رہے ہو تو میرے بدن کے ذرہ ذرہ میں تم ہی بس رہے ہو تو آؤ اب آئندہ تش کے طور پر میرا عکس ریزہ کر دیکھو صاف پاؤ گے کہ میرے ہر ہر ذرے میں تمہاری تصویر ثبت ہو چکی ہے۔ اور ممکن ہے کہ میری ارادت کے خلاف تمہارے یہ نقوش اس وقت تک ضائع نہ ہوں جب تک میری چتا کے شعلے اک فلمی سکرین نہ بن جاویں۔ تمنا ہے کہ دنیا والوں کے لئے وہ نظارہ عبرت کا سامان مہیا کرے۔

تمہارا وہ نامہ بھی ابھی میرے پاس ہے پریتم! جس کا اجرا کراموں انگلینڈ سے ہوا تھا جس میں تم نے ہٹلر پہ رسنا کار ثواب سمجھا تھا۔ جس میں ان کہانیوں کا ذکر درج تھا جو تم نے میری صحبت میں کبھی سنائی تھیں جن کے لفظ لفظ سے تمہارے دل کی دھڑکن سنائی دیتی تھی جس میں تم نے سادہ زندگی کے تلطف کا کھلے دل سے اقبال کیا تھا جس میں مجھے یہاں تک پھسلایا گیا تھا کہ میرے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک فقرہ تمہارے لئے جان بخش تھا۔ تم ہی میری قسم کھا کے کہو پریتم! کہ تمہارے پہلو میں تمہارے اس دل کا کوئی عنصر ابھی تک باقی ہے!

حال ہی میں میں نے اپنے اس استاد محمد دین کی قدمبوسی کی تھی جس کی تنبیہ کا تصور انگلستان تک تمہارے ساتھ گیا تھا۔ اور جن کی بابت تمہیں نے کہا تھا کہ ان کی جماعت میں کاہل ہونا خطرے سے خالی نہ ہوتا تھا۔ وہ کہنے لگے تمہاری صحت ان دنوں قابل رشک ہے۔ گویا تم ایک قوی ہیکل جوان ہو۔ ان کے ان الفاظ پر میرے دل میں ایک عجیب متحرک ناٹک مرتب ہو گیا۔ اور میرے دل و دماغ

خوشی اور خوشحالی کی رن بھومی بن گئے۔ خوشی اس لئے بے پناہ ہوئی جاتی تھی
کہ میرا معبود توانا ہے۔ اور میں لجایا اس لئے کہ تمہارا یوں ذبح ہونا بھی قابل
فخر نہیں۔ چاہئے تو تھا تمہارے بدن کی باگ ڈور تمہاری روح کے ہاتھ
میں ہوتی جو تمہیں خطرناک لڑائی سے دور رکھتی۔ تمہارا بھی کوئی نصب العین ہوتا۔
اور تم ایک بچے خوار ماں کی طرح اپنے ہی ہم وطنوں کا خون پینے پر آمادہ نہ
ہو جاتے۔ حیران ہوں کیا واقعی کبھی خیال نہیں آتا کہ ایک داس کے سینے پہ
بہادری کے تمغے اس کے بہترین داس ہونے کا ثبوت ہیں۔ کاش تمہارا یوں
دیو قامت ہونا تمہارے کمزور بھائیوں کی رہائی کے لئے کام آتا۔ اور تمہارا
نام بھی بھارتی نیتاؤں کی کتھاؤں میں امر ہو جاتا۔ اس ماں کی محنت
پرائی اور دودھ حلال ہو جاتا جس نے تمہیں دکھوں سے پالا پوسا تھا۔ کیا
اچھا تھا کہ تم فخر ہندوستان بنتے اور مشعل دوستاں ہوتے۔ تمہارے دور دیش
نفس استادوں نے یہ کہتے ہوئے بڑا فخر کیا کہ تم پہ تمہارے مغربی آقاؤں نے
تمہارے سنہری وطن کی کچھ زمین بخشش کی ہے۔ اور شاید تم بھی اترانے لگے ہو
اللہ اکبر۔ سوچو تو وہ زمین حقیقت میں پہلے بھی تمہاری ہی تھی۔ فقط یہ
تھا کہ یہ زمین تمہارے ان بے خانماں بھائیوں کے استعمال میں آنی تھی
جن کو انہوں نے غلط نظام سے ان کے آبائی حصے سے بے بہرہ رکھا تھا۔ تمہارے
وہ بھائی جنہیں تم کمینے کہنے کے عادی ہو چکے ہو۔ وہ بے نوا انگریزوں کی
شادیوں کے موقعوں پہ وہاں سے اپنا حق وغیرہ کاٹ لیتے تھے اور تمہارے
علاقے کے غریب کسان اس زمین پر بکریاں پال کر اپنا پیٹ پالتے تھے
اور یہی زمین پرائی تھی اب تم اسے اپنے غریب بھائیوں کا پانی کاٹ کے
اپنی نسلوں پہ ورثہ کے لئے زمین بنا لو گے۔ یاد رکھو تمہارے قتلوں کی قیمت

حقیقت میں تمہارے ان کمین بھائیوں کا خون ہو گی اور تمہاری بچیوں کا
دھواں ان غریب کسانوں کی آہیں ہوں گی - پھر تم ہی کہو پہ تمہارے
محل کس قدر میلے ہوں گے جن کی بنیادوں میں تمہارے وطن کی آہیں
دفن ہوں گی - اور ایسے محلات میں تم کب تک قیام کر پاؤ گے!

میں تمہاری ان بربادیوں کو دل میں دبائے اس راجباہ
پر جو [illegible] کے کنارے ہم پہروں تک درس الفت دہرایا کرتے
تھے - وہاں میں بصد عقیدت یکے سے اترا اور دیر تک اپنے
دل کا جائزہ لیتا رہا - یہ کافر دل پھر بیاباں بن بیٹھا - اور
مجھ سے کہنے لگا کہ یہ کافر خیال ہے ابھی کافر یقین نہیں - تمہاری
وہی معصوم صورت اس بیچارے کے سامنے آئی - وہی لہروں کے ساتھ
ساتھ چلنے والی نسیم فضا کو معطر کرنے لگی - تا حد نظر تک
سرسوں کے کھیت پھولے ہوئے نظر آنے لگے گویا سارا عالم اک
آرتی میں مسحور ہو گیا - اس رات تم پھر خیالاں خواب کے پردے میں آئے
اور جو گفتار وہاں ہوئی بیان سے باہر ہے -

میں قربان ! ابھی ایک اہم کام میرے ذمے ہے یعنی
تمہارے وہ کاغذی نقوش جو تم نے کہا ہے مجھے بھیجے تھے یا
وہ جو میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے لے کر فریم کروائے تھے یا وہ جو
میں نے اخباروں اور باتصویر ویکلیوں میں سے کترے تھے ابھی تک وہ
تمہیں واپس کرنے ہیں - علاوہ ازیں تمہارے خطوط جو تقریباً
دو سو کے قریب تھے اور جن کا [illegible] کیا ہے وہ
سبھی تمہیں واپس کرنے ہیں - جبکہ ان کے بدلے مجھے یا کچھ اور

جو یہ امانت واپس کر کے سُرخرو ہو جاؤں۔ پر ہاں یار! سُرخرو ہی
کہاں؟ افسوس تمہاری وہ تصویر جو میرے مَن کے البم میں چھپا لی ہے
واپس نہیں کر سکوں گا۔ اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔

خدا حافظ۔

(۸)
اُس دنیادار کے نام جس نے اپنے بیٹے کو نوکری کی ذلیل
دہلیز پہ پٹخنا چاہا ...... جس نے تعلیم کے
اصلی مفہوم کو کبھی نہ
سمجھا

اچھے باپوجیو!

تمھارا بلوچستہ! بلبل کو کوّے کا کام زیب نہیں دیتا۔ قلمکار سے تلوار نہیں اٹھتی۔ بہترین جرنیل بہترین جرنیل ہو سکتا ہے اور بہترین حکمران بہترین حاکم۔ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو نلوے کی جگہ دی جاتی تو وہ ادنیٰ درجے کا نلوہ ہوتا اور اگر نلوے کو مہاراجہ کے سنگھاسن پر بٹھایا جاتا تو وہ ایک عام رنجیت سنگھ ہوتا۔ شہنشاہ اکبر کو اگر فیضی بننا پڑتا تو وہ ایک ناکام فیضی ہوتا اور اگر فیضی کو تاجدار ہند بنایا جاتا تو وہ ایک ناکام بادشاہ ہوتا۔ پس ہر بشر کو اپنے مذاق کے موافق پیشے کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ مصور گو دربدر پھرتا ہے لیکن جو لمحات وہ تصویر کھینچنے میں صرف کرتا ہے وہ فرشتوں کو بھی میسر نہیں ہوتے۔ اس قلیل عرصہ میں وہ دنیا بھر کا سُکھ اٹھا لیتا ہے۔ اس کی سب کلفتیں مٹ جاتی ہیں۔ وہ باغباں جس کا کام فلاحت ہے جب پودے لگاتا اور ان کو سینچتا ہے تو اسے وہ پودے تخت طاؤس پر ناچتے ہوئے مور معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان کی بلائیں لیتا پھرتا ہے۔ وہ اس لئے پودے نہیں لگاتا کہ وہ ان کے پھل کھائے گا۔ نہیں، وہ اپنی تسکین باغبانی میں ہی تلاش کرتا ہے۔ وہ فن کار ہے اس کی محنت کا بدلہ فلاحت ہے نہ کہ انجام فلاحت!

"قافلے والے چل دیئے ہیں ہاتھ ملتا رہ گیا" جی ہاں۔ لیکن باپوجی تمہارے یہ طعنے فقط اس آدمی کو چڑا سکتے ہیں جس کے ساتھی اسے سوتا چھوڑ گئے ہوں۔ یا جس نے قافلہ والوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کی سکت ہی نہ ہو۔ بھلا باپوجی! اپنی مرضی۔ اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ قافلہ غلط راستہ پہ جا رہا ہے، قافلے کا ساتھ چھوڑ بیٹھا۔ وہ ہاتھ کا ہے کو ملے گا۔ اگر وہ دیدہ دانستہ قافلے کا ساتھ نہیں دیتا اور یہ اس کا اپنا سمجھتا ہے

وہ نادان نہیں تو کیا ہے! جن دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے کی تعلیم پاتا تھا ہر روز کالج کے بڑے دروازے پر رُک کر دیکھا کرتا تھا کہ سب لوگ ایک ادنیٰ مقصد کے حصول میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا دکھائی نہ دیتا تھا جسے یاد ہو کہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے اور سدا رہنے کی جگہ نہیں۔ میں نہیں کہتا دنیاوی فرائض سارے ہی بھلا دئے جائیں لیکن اتنا تو ہر ذی شعور کو پتہ ہونا چاہیئے کہ حق حق ہے اور باطل، باطل۔ کیا دنیاوی فرائض کو ادا کرتے ہوئے یہ احساس دل میں نہیں رکھا جا سکتا کہ یہ امتحان بھی ضروری ہے مگر آخری امتحان بھی اختیاری نہیں۔ اگر دنیا والے آخری امتحان کو بھول نہ جاویں تو ہم جماعتوں میں ایک دوسرے کے لئے سچی ہمدردی اور برادرانہ پیار کیوں نہ ہو۔ مقابلے کے امتحان کیوں ضروری سمجھے جاویں۔ کیوں نہ ہر کوئی اپنے سے بہتر ساتھی کو اپنی جگہ دے کر خوشی محسوس کرے۔ ہر شخص کیوں نہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر پیرائے میں کام کرے۔ کیوں کوئی اپنے گزارے سے زیادہ مال و متاع جمع رکھے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے غریب ملک میں جس کسی کے پاس گزارے سے زیادہ سامان جمع ہے وہ دوسرے غریبوں کا پیٹ کاٹنے کی وجہ سے ہے۔ کیا یہ حرام نہیں۔

بابو جی! میں حصولِ تعلیم کا مقصد انسانیت سمجھتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں تعلیم روح کی غذا ہے۔ تعلیم اپنا انعام آپ ہے۔ تعلیم اچھا شہری بناتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم قربانی کا سبق دیتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم ہمدردی اور رحمدلی کے لئے اکساتی ہے۔ آپ تعلیم کو ملازمت کی تربیت و تیاری سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں تعلیم خودداری کے جذبہ کو بیدار کر کے غلامی سے دور ہٹاتی ہے۔ فرض کرو ہر شہری گریجویٹ ہو جاتا ہے ہر ایک اگر افسر ہی بننا چاہے تو ماتحتی کون کرے گا۔ بہرحال تعلیم کا مقصد ملازمت جیسی کمینہ ذہنیت کی چیز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا اصل مقصد انسانی مساوات کے لئے جد و جہد ہونا چاہیئے۔

آپ ہر خط میں یہی لکھتے ہیں کہ مجھے ملازمت کر لینی چاہئے۔ میں حیران ہوں نوکری
کبھی کوئی معزز پیشہ ہے۔ ایک آدمی کو کئی شہدا ماتحت پڑتے ہیں۔ اور اگر افسروں میں
کوئی انسان ہو تو اسے سلام کرنا چنداں برا نہیں مگر ان دونوں کیفیتوں میں جو سر درد اٹھا کر
سے اعلیٰ تربیت تک پہنچ جاتے ہیں۔ آپ ہی کہیں ایسے آدمیوں کی ماتحتی کرنا گناہ کبیرہ نہیں
تو کیا ہے۔ کون ضمیر فروشی کرے گا ان خود پرستوں کی ماتحتی کر کے۔ جس افسر میں ذاتی
شرافت نہیں ہوتی، وہ اپنے سے بڑے حاکموں سے دبا رہتا اور اپنے ماتحتوں کو دبا
دباتا رہتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں غلامانہ ذہنیت عام ہے۔ لڑکے ایسے پیشے کو
اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی کو سچی خوشی حاصل نہ ہو بلکہ جو اس کی اپنی طبیعت کے خلاف ہو تو یہ
دن کی خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟ ملازمت میں دوسروں کی فرمانبرداری اپنے ضمیر کی بھی
ہے اور جس کام میں کارندہ کا دل نہیں لگتا ہو وہ انہیں خاک خوش کرے گا نہ کوئی وہ
ذمہ دار ہے۔ فرض کرو ایک ٹیچر ہے۔ استاد کے پیشے کے لئے وہ پیدا نہیں ہوا۔
اس کی زبان میں وہ کشش ہی نہیں جو ایک کامل استاد کی زبان میں ہوتی ہے۔ نہ وہ خود
اس کام میں خوشی حاصل کر سکتا ہے اور نہ طالب علموں کو ہی خوش کر سکتا ہے۔ ایسا استاد
کتنا گناہ نہیں کرتا ہے۔ جو پیشے کے غلط انتخاب سے دوسروں کو ستاتا ہے وہ ظالم
نہیں تو کیا ہے۔

سقراط حکیم کا قول ہے کہ "بعض آدمی کسی کام کو صحیح سمجھنے کے باوجود
اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ میں انہیں داخل جمادات سمجھتا ہوں"۔ واقعی باوجی! میرے کئی
ہم جماعت ایسے ہیں جنہوں نے زندگی کی دوڑ بلا سوچے سمجھے شروع کر دی ہے۔ انہوں نے
پیشہ کا انتخاب کیا ہی نہیں ہوا ہے۔ جبکہ وہ سمجھ بھی چکے ہیں کہ انہیں وہ کام پسند نہیں وہ اس کو
چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔ جب کبھی مجھے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ میں انہیں از راہ رفاقت
پوچھتا ہوں کہ کیوں بھائی کیسی کٹتی ہے؟ تو وہ سر پیٹ لیتے ہیں کہ بس زندہ درگور ہیں۔

دل تو نہیں چاہتا کہ یہ کام کریں۔ اگر سپاٹ کا کتنا بڑا نامراد ہے۔ میں حیران ہو جاتا ہوں کہ یہ گریجویٹ ہو گئے ہیں کہ انھوں نے عمر قید کی سزا پائی ہے۔ نہ معلوم وہ کیوں کولھو کا بیل بن گئے ہیں۔ جمنا کلرکی نہیں موافق تو بکریاں کیوں نہیں پال لیتے! کتنا معزز پیشہ ہے جس کو بعض پیغمبروں نے بھی اختیار کئے رہے ہیں۔ مزدوری کیوں نہیں کر لیتے؟ دستکاری کیوں نہیں سیکھ لیتے؟ ایک تو صحت برقرار رہے دوسرے رات کو کھوٹے سے بیچ کے سوچا یا کریں۔ کیا پڑی ہے جو ساری رات نہیں کہتے گئیں۔ پڑھتے تھے تو استاد کا غم تھا، اب کمینے افسروں کا رعب ان پر طاری رہتا ہے۔ اگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تو ایک پہاڑی بکرا اور ایک گنگوتری کا بندر سدھا لیں۔ جہاں جائیں زمین ان کی ہے۔ آپ ہنسیں دوسروں کو ہنسائیں۔ یہ تو ہندوستان سے جہاں کے سپرے بھی کسی قیصر سے کم نہیں ہیں۔ اگر سانپوں سے کچھ ڈر لگتا ہے تو جسمانی ریاضت میں مہارت حاصل کریں بس چند قلابازیاں کھائیں اور پیٹ کا کتا خاموش کر لیا۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو گھاس پات کھا کر گذارہ کریں آزادی کی اکسیر نہیں تو نا بنا دے گی۔ مگر کیا کریں، ان پیشوں میں ٹائی باندھ نہیں بنا جاتا۔ ہوٹلوں کی بوسیدہ میزوں کے بوسے نصیب نہیں ہوتے۔ پتلون کی پالش سے پیدا ہونے والی لو اسیر کا مزہ نہیں ملتا، ٹی۔ بی کی انگیٹھی والی حرارت میسر نہیں آسکتی، اور نہ افسروں کے جوتے چاٹنے سے حاصل ہونے والے نمکین چٹخارے ہی مل سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں "پاسنگ شو" کے دھوئیں سے جگر سیاہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

کیا کہوں بابوجی! کیا آپ مجھے ضرور دوست کے دروازے پر دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں ساری دنیا کو تو چھوڑ سکتا ہوں بابوجی! مگر میں اپنے تئیں جھٹلانا نہیں چاہتا۔ مجھ لوبھ کا بوجھ ہیں نفس پرستی کی غرض سے سقراطی پتھر نہیں بننا چاہتا۔

ختم شد

(۹)

اُس بیوفا کے نام جس نے اپنی میٹھی باتوں سے ایک معصوم دل
کی دھڑکن بڑھا دی!

اُن کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ تم اس کے تنے کو تھپیڑے دیکر اسے خاموش کر دیا کرتے تھے۔ اور میں اس پر کھلکھلا کر ہنس دیا کرتا تھا۔ بڑھمیاں تگڑا کرتے تھے اور بلبلا کر ہمارے کپڑوں پر تھوک دیا کرتے تھے۔ جوں جوں رات بھیگتی جاتی تھی، بادل اور گھنے ہوتے جاتے تھے۔ بادل کی گرج سے دبک کر میں بڑ کے ساتھ اور چمٹا جاتا تھا جس طرح ہم ایکبار طوفان کے دوران ایک دوسرے سے لپٹ کر بے خطر ہوئے تھے۔ جونہی میں بڑ کو بھینچتا تھا، میرے گال گرم ہو جاتے تھے۔ لرزہ تھم جاتا تھا۔ اور یوں ایک عجیب لہر میرے تن بدن میں دوڑ جاتی تھی گویا میں واقعی تمہارے ساتھ لپٹا ہوا ہوں۔ پھر تو سن میں سے ایک نیولا پھدک کر میری پیٹھ سے ٹکرایا میری ہائے نکل گئی۔ میں نے سمجھا سعیدہ نے آلیا۔ کئی بار پتوں کی آوازیں تمہارے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ اب خوب لڑوں گا ان سے۔ کئی بار میں نے نڈر ہو کر آنکھیں کھولنے کی ناکام کوشش کی تمہیں نہ آنا تھا نہ آئے۔

اب کونسا بہانہ بناؤ گے امرت! اب کے بھی لکھ بھیجو کہ اس رات تم بیحد مضطر رہے۔ اب کبھی میں تمہارے چکموں میں نہیں آؤں گا۔ اب میں نے جان لیا ہے کہ تمہارے دل کا ریڈیو بگڑ چکا ہے۔ یہ ہوا کی ان لہروں کو اب نہیں پکڑتا جو میرے دل کے مضراب سے متحرک ہوتی ہیں۔ اب میرے نزدیک محبت گناہ ہے اور دوستی دھوکا۔

شکریہ!

(۱۰)

اُس اہم جماعت کے نام جس نے اپنی ظاہرداری کی خاطر بیسوا جیسے
ضروری ادارے کے خلاف جہاد کیا ..... جس نے ان سے
حقِ عبادت چھیننا چاہا ..... جس نے کبھی نہ سوچا
کہ شادی سے محروم رہ جانے والے
صحت ور نوجوانوں کے نفسی اُمسر خمار
کے موسم میں بیسوا کی
ہستی کس قدر
ضروری
ہے

یہ فسونگر انہیں بھی خیراتِ حسن سے مالا مال کر دیتی ہیں کیا؟ ان میں اور وطن پرست بی بیوں میں فرق فقط یہ ہوتا ہے کہ ایک گروہ کا دائرہ محض امیروں تک محدود رہتا ہے۔ اس گروہ کی فیس بعض حالتوں میں تو زرق برق پوشاک ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات ناز برداری اور سبک سری اور اگر یہ دوشیزہ بی بیاں ابھی کالج کی طالبات ہوں تو مختلف لائبریریوں کی آوارہ گردی یا کبھی کبھار ٹائی بابوؤں کی چکنی چپڑی باتیں۔ غرض اس گروہ کی فیس یا تو ایسی ہوتی ہے یا اس کی ادائیگی کچھ اس انداز میں ہوتی ہے کہ ان تک صرف ٹائی بابو پہنچ سکتے ہیں یا ان ٹائی بابوؤں کے صحت ور اور نوعمر نوکر۔ دوسرا گروہ ہر ضرورت مند شہری کی قدر کرتا ہے۔

دیکھو اجمل! ہندوستان جیسے ملک میں بیسوا کا پیشہ کس قدر مفید اور ضروری ہے۔ جس ملک میں شادی شدہ ساٹھ فی صدی سے زیادہ نہ ہوں اس ملک میں یہ پیشہ کس قدر اہم ہے۔ تمہیں تو جیون ساتھی مل جائے گا ذرا ان نوجوانوں کی سنو جو ٹھیک صحت ور ہیں مگر جنسی پیاس بجھانے کے لئے جنہیں عورت کی صحبت کبھی میسر نہیں ہوتی۔ آخر ملک کے عوام تمہاری طرح صوفی ہونے سے تو رہے جن میں نفس ہمیشہ کے لئے خوابیدہ ہو سکے۔ موسم بہار آتا ہے تو سوکھے درخت بھی سرسبز ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ مردہ مٹی میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ پھر تم ہی کہو اجمل! یہ صحت ور نوجوان نفسی خمار کے موسم میں کونسا راستہ اختیار کریں۔ کیا نر و مادہ کا ساجھا فطری نہیں؟ اگر یہ بندھن فطری ہے تو پھر تم ان وطن پرست بی بیوں سے حقِ عبادت کیوں چھیننا چاہتے ہو۔ ہر بشر میں شہرت کی خواہش ہوتی ہے، ہر عورت میں ماں بن کے اولاد کے ذریعے امر ہونے کی غیر شعوری تمنا ہوتی ہے۔ ہر فرد میں اپنے عیوب چھپانے کی لگن ہوتی ہے۔ مگر یہ حوا کی پوتیاں ہیں کہ کھلے بندوں اپنے فعل کا اقبال کرتی ہیں۔ نہ اپنے بھائی بندوں کو دھوکا دیتی ہیں اور نہ سماجی وقار کی جڑ کاٹتی ہیں۔ وہ

ان شوہروں نے لمحات کا بھی ہنس ہنس کر مقابلہ کر گزرتی ہیں جن میں سچے جیون ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ وہ رائے عامہ کے اٹھے ہوئے طوفان کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کر گزرتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے بڑھیا ہونے کے بعد ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا مگر وہ خود کو دھوکا نہیں دیتیں۔ اجمل بھائی! اگر یہ وطن پرست بی بیاں رفاہِ عامہ کا کام بند کر دیں تو گھر گھر میں بازاری عمل جاری ہو جائے۔ قتل کی وارداتیں جو تگنی ہو جائیں بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگے۔ قومی عفت کی چادر چاک چاک ہو جائے جن گھروں میں پانچ چھ بھائیوں میں سے فقط ایک دو کی شادی ہوئی ہو وہ گھر سب بازار بن جائیں۔ اور جو نوجوان اپنی نفسی خواہشات کو ارادۃً دبائیں وہ صحت جیسی نایاب دولت کو کھو بیٹھیں، اور کئی ایسی تباہ کن عادات کا شکار ہو جائیں جن سے مرتے دم تک پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے۔

دیکھو دوست میری ان سچی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہ کر لینا کہ میرے دل میں پتی برتا بیویوں کی قدر ہی نہیں۔ میں ان شریف زادیوں کی خاک پا کر سر آنکھوں پر رکھنے کو تیار ہوں جو واقعی ایک شوہر کی پرستار ہیں جنھیں اپنے ماں باپ کی لاج رکھنا ہر قیمت پہ منظور ہے جو پدمنیاں قوم کے ناموس کا خیال رکھتی ہیں۔ جو اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہندوستانی بیوی اپنے شوہر کی صورت میں ایک مرد کی تو بے شک عمر بھر داسی ہے مگر اس کے چار پانچ بھائی اس کی عزت و آبرو پر ہر وقت نثار ہونے کو تیار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس دو ٹکی بیسوائیں جوانی میں تو بے شک بیسیوں ٹائی بابوؤں کو زیر کر لیتی ہیں مگر جونہی ان کے لبوں کی سرخی مدھم پڑتی ہے، جونہی ان کے سینوں کا ابھار انحطاط پذیر ہوتا ہے اور کاجل کے تیر سیدھے ہو جاتے ہیں سب ٹائی بابو ان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے باغیرت بھائی بند بھی اب انہیں پناہ نہیں دیتے یہ کلنک کی بیٹیاں بعض اوقات بے بسی کے عالم میں خودکشی کر کے دنیا سے روپوش ہو جاتی ہیں۔

تمہاری سب سے بڑی شکایت یہ ہے اجمل! کہ بازاری بیویوں کی

صحبت سے نوجوان متعدی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بے شک ان امراض کی روک تھام ہونی چاہیئے۔ اس کام کے واسطے ایک جدا محکمہ درکار ہے۔ ان وطن پرست بی بیوں کو گورنمنٹ کی طرف سے معقول تنخواہ ملنی چاہیئے۔ باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر متعین کئے جاویں جو نوجوانوں کی صحت کا ملاحظہ فرما کر ٹکٹ جاری کریں۔ ہر چھ مہینے بعد ٹکٹ یافتہ نوجوانوں اور وطن پرست بی بیوں کا طبی ملاحظہ کیا جائے۔ ہر شہر میں بازار کے دونوں سروں پہ چنگی کے محصولیوں کی طرح ٹکٹ کا اندراج کرنے والے سرکاری مختار بیٹھے ہوں۔ بس چند سالوں میں ان امراض کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور یہ محکمہ ملک کا ایک معزز محکمہ ہوگا۔ وطن پرست بی بیوں کی فہرست میں فقط ان کا اندراج ہوگا جو اپنے تئیں اس قومی خدمت کے لئے پیش کریں گی۔ اگر ایسی بی بیوں کی تعداد ضرورت سے کم ہو تو دوگنی بیسواؤں میں سے چکلا منتخب کی جاویں اور اگر ان وطن پرست بی بیوں سے اولاد پیدا ہو تو ان کو حسب لیاقت معتبر اسامیوں پر مقرر کیا جاوے۔

جی ہاں تمہاری دوسری شکایت بھی ایک حد تک قابل غور ہے کہ شادی شدہ اشخاص وطن پرست بی بیوں کو کیوں ستاتے ہیں اور پتی برتا دیویوں کو کیوں دھوکا دیتے ہیں؟ یہ بھی ہمارے دیس کی شادی کے غلط طریقے کی وجہ سے ہے۔ شادی شدہ جوان فقط اس حالت میں بازار حسن میں جاتا ہے جب کہ اس کی پسند کے خلاف اس کو کسی لڑکی سے سماجی طور پر پھانسا جاتا ہے۔ شادی کی مروجہ رسم میں اگر ذرا سے ترمیم کی جاوے تو کوئی بھی شادی شدہ آدمی وطن پرست بی بیوں کے لئے بار ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر کوئی صوفی حسن کے بازار میں خدا کی شان دیکھنے کے لئے جا نکلے تو کچھ برا نہیں۔ اور نہ ہی کسی کو اس امر کی شکایت ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ بعض سنگیت کے پیاسے وہاں راگ کی تلاش میں جا نکلتے ہیں وہ بھی بے شک تشریف لے جایا کریں مگر ہر شہری کو خیال ہونا چاہیئے کہ وطن پرست بی بیاں بھی انسان ہیں خواہ مخواہ ان کا قیمتی وقت برباد نہ کیا جائے۔

(۱۱)

اُس کوتاہ نظر دوست کے نام جس نے اپنے اُس دوست کو جو
ہندوستان کے غریبوں کے درد میں شریک تھا اور کسی
مہلک مرض میں مبتلا تھا، امریکہ کی مادی
فضاؤں میں بھیج کر بچانا
چاہا۔

کیا بتاؤں تبسم!

ہندوستان کو چھوڑنے کا خیال آتا ہے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ آج میں بازار
پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سپیرا گیروے کپڑے پہنے بہنگی اٹھائے۔ کالا
کلوٹا، کانوں میں پیتل کے بڑے بڑے بالے، نیلی آنکھیں، منتشر داڑھی، تراشیدہ
مونچھیں، لاابالیانہ پگڑی، عین ایک رند مشرب کی طرح آیا اور آتے ہی کچھ اس انداز
سے مسکرایا کہ میری روح اس میں منتقل ہو گئی۔ دل چاہتا تھا کہ اس سے لپٹ جاؤں۔
حلوائی نے اسے آنکھیں دکھا کے دور کرنا چاہا۔ اس نے حلوائی کو ایک نقاد کی طرح
بھانپا۔ خدا کی قسم عجیب نظارہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی روح کے دو حصے برسوں
کی بیگانگی کے بعد یگانہ ہوئے ہیں۔ دونوں میں سے ہندوستان کی مٹی کی بو آ رہی تھی۔
میں ایک نادان کی طرح کبھی ایک کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف تک رہا تھا۔
سپیرا محض ایک بھکاری دکھائی نہ دیتا تھا بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیہہ حق جتانا چاہتا
ہے۔ گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ اس دودھ میں اس کی بھی شرکت ہے۔ یعنی
وہ پکار اٹھنے کو تھا کہ وہ دودھ دراصل اس کے وطن کی بھینسوں کا ہے جو خداداد آب و
ہوا پہ پرورش پا رہی ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں یگانگت اور بیگانگی گھل مل رہی تھی۔
حلوائی نے کٹوری میں بالائی دے کے سانپ کو ٹالنا چاہا۔ اتنے میں میں جھٹ بیٹھا کہ بابا دکھاؤ
تو کیسے ہیں تمہارے سانپ! سپیرے نے پر شکوہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور وہ گرد و پیش
کے الٹے کہہ کے بیٹھ گیا۔ تمہاری قسم تبسم! پٹارے کا کھلنا تھا کہ بھارت کا سپوت "ہول"
سے کھڑا ہو گیا۔ اور جوں جوں بین کی تانیں تیز ہوتی گئیں وہ چھبیلا سانپ ہوا کی لہروں کے ساتھ
ساتھ سر دھننے لگا۔ گویا وہ اپنے سپیرے بھائی کی بین کی داد دے رہا تھا۔ یا اپنے رفیق کی

دوستی کا دم بھر رہا تھا۔ میں خوشی میں بے آپے ہوا جاتا تھا۔ کئی بار سپیرے نے تماشہ ختم کرنا چاہا مگر میں برابر کہتا رہا کہ بابا ذرا اور۔ آخر سپیرے کا سانس پھولنے لگا۔ میں نے وہی چونی جس کا میں نے دودھ پینا تھا سپیرے کی نذر کی اور ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کیا۔ حلوائی نے مجھے گھورتے ہوئے طنزاً پوچھا۔ دودھ پینا بھلا تھا یا سانپ دیکھنا! میں نے اس کا جواب آنکھ سے دیا اور اپنی راہ لی۔

ابھی میں چند گز ہی چلا تھا کہ ایک مسلم ضعیف کوئی سیر سوا سیر کالے سے کھجور اپنے چھابے میں رکھے سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ جونہی میری نظر بوڑھے میاں پر پڑی اس نے کہا آ بیٹا! ذرا چکھو تو میرے ملتانی خرمے۔ میں نے اس کی تسلی کے لئے پہلے شیروانی کی جیبیں دیکھیں، پھر جاکٹ کی پر کوئی پیسہ نہ پایا۔ میں ایک ہاتھ سے بابا کے ملتانی خرموں سے کھیل رہا تھا اور دوسرے سے پیسے نکالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ بزرگ سمجھا کہ میں کھجوروں کا بے حد مشتاق ہوں۔ اس نے مٹھی بھر کھجوریں اٹھا کر میری طرف بڑھائیں۔ میں نے اب کے جھلا کر شیروانی کو جھاڑا۔ تو اس میں سے سکوں کی آواز سنائی دی۔ بوڑھا بابا فوراً تاڑ گیا کہ شاہی خزانہ ابھی خالی نہیں ہوا۔ بات یوں تھی کہ جیب میں بکثرت ہاتھ ڈالتے رہنے سے اس کا استر پھٹا ہوا تھا۔ اور ایک سوراخ کی راہ سے دو آنے دور پہنچ گئے تھے۔ میں نے ان میں سے اکنی بابا کو ادا کی اور سلام کہہ کے آگے چل دیا۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ انگریزوں کا یہ کہنا کہ ہندوستانی محنتی نہیں ہوتے کس قدر بے جا ہے۔ ہندوستانیوں کو تو قبر کے کنارے بھی آرام نہیں ملتا۔ مجھے اب اس بوڑھے میاں کا رہ رہ کے خیال آتا ہے۔ کوئی ستر اسی برس کی عمر، ڈگمگاتی ہوئی دستار، اداس ابرو، کم نمبر کی عینک اور فریم کی جگہ دھاگے، معمولی حنائی داڑھی، مٹیالی مونچھیں، آنکھوں سے ابھری ہوئی رگیں، دکھوں سے دوہری کمر، تن برہنہ، پاؤں میں ٹوٹے ہوئے جوتے۔ خداوند عالم! تیری دنیا میں انگریزوں کے غلام کی یہ دشا۔ میرے بس میں ہوتا تو اتنی بے غیرت

جوانی کو گندے نالے میں دے مارتا۔ اور اسی بزرگ کے بالمقابل بیٹھ کے ایسی صدا ئے احتجاج بلند کرتا جو ہفت اقلیم کو ہلا دیتی۔ میں قدم قدم پر سوچ رہا تھا کہ میرے امریکہ سے آنے تک یہ بابا کہاں ہوگا؟

میں انہیں خیالوں میں سرمست تھا کہ ایک بھڑبھونجن بیٹھی نظر پڑی۔ وہ چنے بھون رہی تھی۔ اس کے گرد ننھے ننھے بچے بیٹھے تھے۔ وہ ابھی چھبیلی دوشیزہ تھی مگر میاں رانجھن پیاس کے لگ بھگ۔ ایک بچہ بسور کے کہنے لگا رتو بی میری باری! میں نے باری والے گنے تو وہ تعداد میں گیارہ تھے۔ گویا بارھویں باری میری تھی۔ رتو بی کا خیال تھا کہ بچوں کا نمبر کاٹ کے وہ میرے دانے بھون دیتی مگر رانجھن نے نتھنے پھیلا کر کہا نگوڑی ناہیں! باری رکھ باری! میں نے بھی ناچار اتفاق ظاہر کیا۔ میں تمام وقت دیکھا کیا رتو بار بار اپنے ماتھے کے زخم سے جس پر پیپ پٹی ہوئی تھی مکھیاں دور کرتی رہی۔ وہ ایک دوسرے کو پیار کی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ رانجھن رتو کا کوئی بزرگ ہوگا جس نے غالباً رتو کو یتیم ہونے کی حالت میں پالا پوسا ہوگا۔ جب سب بچے چلے گئے تو میں نے رانجھن سے پوچھا رتو تمہاری بیٹی ہے کیا؟ رانجھن قدرے شرما گیا اور کہنے لگا رتو میری صبب دلہن مایا ہے۔ یہ سن کے رتو کے ماتھے سے تیور صاف ہو گئے، اور خوشی کی لہر پسینہ کے قطروں میں جھلک دکھانے لگی۔ میں نے پوچھا یہ زخم درست کیوں نہیں کروا لیتی رتو۔ یہ سن کے رتو کی سرمگیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اور وہ آنکھ سے بتا گئی کہ یہ سب رانجھن کی بدمزاجی کے نشان ہیں۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ چاہتا تھا کہ ظالم رانجھن کو بھاڑ میں جھونک دوں۔ پھر خیال آیا کہ یوں رتو زندہ ستی ہو جائے گی۔ اور ایک رانجھن ہو تو بھاڑ میں اسے جھونکوں یہاں تو پینتا نوے فی صدی رانجھن ہیں۔ وہاں سے کئی درد دل کو پہلو میں دبائے آگے چل نکلا۔

تو بہیر بسنم! فرض کیا میں ہندوستان سے چلا بھی جاؤں تو کیا واقعی ہندوستان

میرے ساتھ وہاں نہیں جائے گا۔ سچ جانو تو یہ ہندوستانی سانپ، سپیرے، الغوزے کی لَے،
کھجور والے اور راکھشس سب تخیل ہیں یا نہیں اور یہیں اُن سب ہیں۔ میرے پیچھے جانے کے بعد بھی
ان کے زخم، ان کے کھٹے میٹھے کٹیلے، ان کے باہمی جھمیلے سب کے سب میرے
دل کی لوح پر مُہر کی طرح ثبت ہو گئے۔ امریکہ تو کیا بہشت بھی میری موجودگی سے دوزخ
بن جائے گی۔ اور یہ دشمن نظارے میری خواب کی دنیا کو خراب کر دیں گے۔ یقین ہے
کہ ان کا اثر میری صورت کو یوں بھیانک بنا دے گا کہ سب وہاں مجھے بھوت سمجھا کریں گے۔ نہ
بابا مجھے یہی تمہارا امریکہ مبارک!

جے چند۔

(۱۴)

اس عشوہ گر کے نام جس نے کسی کو اپنا کر بیگانہ کر دیا۔۔ جس نے
دماغ کی دنیا تو جیت لی مگر دل کی دنیا کی
کٹھن منزلوں سے شکست کھا لیتا۔

ارشی!

کل میں نے دنیا سے دور جا نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ میں دیوانہ وار کہیں جا رہا تھا کہ رات کی رانی نے مجھے پھانس لیا۔ اس کی خوشبو نے تصور میں تیری عنبریں زلفیں میرے چہرے پہ پریشان کر دیں۔ زندگی کی ٹمٹائی ہوئی جوت پھر سے جاگنے لگی۔ دھند لے بادلوں میں سے سنہری چاند جو نظر آیا تو یکا یک تیری موہنی مورت میرے سامنے آگئی۔ گویا تو پھر اپنے ہاتھوں کی دوربین بنائے میرے کمرے کے مشرقی شیشوں میں سے مجھے ڈھونڈ رہی تھی ارشی! پھر سے میرے دل کا پنچھی پھڑپھڑانے لگا۔ مجھے دنیا سے دور لے جانے والی تھکن پل بھر میں کافور ہو گئی۔ تیرے نرم و نازک ہاتھوں کے مس کا تصور پھر سے مجھے گدگدانے لگا۔ تیری ستمگیں آنکھوں کی گھلاوٹ اور پُرنم کیفیت سے میری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ہاں ارشی! تیری شرابِ محبت کی کشش مجھے کنارِ عدم سے پھر کھینچ لائی۔

ارشی! قدرت نے میری روح کی ساری غذا تجھی میں ذخیرہ کر دی ہے۔ تیرا اشارہ مجھ میں پھرتی پیدا کر دیتا ہے۔ تیرا قرب تھا تو ساری دنیا میرے قریب تھی، تجھ سے دوری ہے تو ساری خدائی سے بیگانہ ہوا چاہتا ہوں۔ ارشی! میرے قیاس میں ہر شے کا معیار تجھی سے شروع ہوتا ہے۔ میں تیرے جوڑے کے مقابلہ میں حسینوں کو، تیرے کپڑوں کے مقابلہ میں پھولوں کو، تیرے مکھڑے کے مقابلہ میں چاند کو، تیرے ہاتھوں کے مقابلہ میں ریشم کو، تیری کلائی کے مقابلہ میں شاخِ گل کو، تیرے رخسار کے مقابلہ میں کشمیری سیب کو اور تیری زبان کی مٹھاس کے مقابلہ میں شہد کو ادنیٰ نمبر دیتا ہوں۔ ارشی! تیری رعنائیوں نے دنیا کو میری نظر میں پھیکا کر دیا ہے۔

(۱۳)

اُس شخص کے نام جس کے سر سے کبھی مذہب کا بھوت کبھی نہ اترا
جس نے مذہب انسانیت کی چاشنی کبھی نہ چکھی...
جس نے ہمیشہ آدمی کو انسان پر ترجیح

دی

مخدومی!

سانچ کو آنچ نہیں۔ میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ جہاں مذہب ختم ہوتا ہے فلسفہ کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی مذہب کو اگر فلسفے سے علیحدہ کر دیا جائے تو مذہب میں دلیل کو دخل نہیں اور فلسفے میں ہر چیز شعور اور استدلال کے سانچے میں ڈھالی جاتی ہے۔ پابند مذہب کا یقین کامل ہوتا ہے اور فلسفی کا ادراک روشن۔ مذہب کی تبلیغ دل کی دنیا میں زیادہ ممکن ہے اور فلسفہ کی اشاعت دماغ کی دنیا میں۔ کم خواندہ صرف مذہب کی شاہراہ پر چل کر انا الحق کی منزل کو پہنچ سکتا ہے۔ شعوری کھوج کرنے والا شخص اپنے من کے سدھار سے زندگی کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مذہب کا راستہ تنگ مگر آسان ہوتا ہے، فلسفہ کا وسیع مگر کٹھن۔

آپ ہمیشہ مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ میرا مذہب کیا ہے۔ میں حیران ہوں وہ بشر جس کا مذہب انسانیت ہو وہ کس طرح دیدہ دانستہ دوسروں کو جھٹلانا شروع کر دے کہ فقط فلاں گروہ میں ایشور کی شکتی ہے، فلاں پیغمبر اچھا ہے فلاں اوتار کامل نہیں! اگر ایشور ایک ہے تو پھر رسمی مذاہب کیوں مختلف ہیں۔ انسان کو کیا پڑی ہے جو قدرتی مذہب چھوڑ کے رسمی مذہب کے تنگ دائرہ میں پابند ہو۔ میں تو حیران ہوں اچھا خالق ہے رسمی مذہب والوں کا جو شخص اپنی دل لگی کی خاطر مختلف رہنما بھیج کر اپنے بندوں کو گمراہ کرتا ہے۔ حیف ہے بندے سب ایک ہی خالق کے ہوں اور کسی کو ختنہ حلال اور چوٹی حرام اور کسی کو چوٹی حلال اور ختنہ حرام۔ کسی کو ملنے کے لئے وہ مشرق میں بستا ہے اور دوسرے کو خوش کرنے کی خاطر وہ مغرب میں جا کر رونما ہوتا ہے۔ کہیں وہ ناقوس کی آواز کا شیدا ہے اور کہیں اذان پر فدا۔ عجیب تماشا ہے اس کے نام پر انسان اپنے بھائیوں کا گلا کاٹیں اور وہ ٹس سے مس نہ ہو۔ وہ ہے ہر جگہ حاضر ناظر، وہ بستا سب میں ہے پھر قاتل کون اور مقتول کون۔ پھر کعبہ کس کا ہے اور بتخانے میں کون ہے!

(۱۴)

اس شخص کے نام جس نے اپنے بیٹے کو انسان بنانے کبھی یہ
خیال نہ کیا کہ آخر اس بچارے کو اس دنیا میں رہنا
ہے جس میں اکثر آدمی بستے ہیں اور
انسان کہیں کہیں۔

ابھی مجھے یاد ہیں بسنت بہاریں، جب تم مجھے بسنتی جوڑا پہنا کر کھیتوں میں لے جایا کرتی تھیں۔
اور میں سرسوں کے پھولوں میں کیسری پھول بنا چھپا کرتا تھا۔ تم دور رہٹ پر انگلی اٹھا اٹھا کر
بتایا کرتی تھیں کہ تمہارا چاند کہاں ہے!

کیا سالہا سال دنیا میں رہ کے بھی تمہیں اس بات کا علم نہ ہوا کہ یہاں فقط آدمی
بستے ہیں انسانوں کا مسکن کہیں نہیں ہے۔ بچپن میں تم نے مجھے یوں پڑھایا تھا۔ کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ شیر
حملے کے وقت کسی شے سے بھی نہیں جھجکتا یعنی وہ وعدہ کرنے سے پہلے تو سو بار سوچے پر وعدہ ہو
جانے کے بعد نہ جلتی ہوئی آگ اس کا راستہ روک سکتی ہے، نہ اتھاہ پہاڑوں کے سلسلے اس کے پاؤں تھام
سکتے ہیں، نہ لق و دق بیابانوں میں اس کا جی چھوٹتا ہے، نہ جنگل بیابان دیکھ کر وہ واپس ہوتا
ہے۔ شیر آخر حیوانِ مطلق ہے وہ پے در پے سدھانے سے سرکس کی بکری کے آگے دوڑا کرتا
ہو جائے تو ممکن ہے، پر شیر بچہ کو ساری خدائی بھی خودداری سے دور نہیں کر سکتی۔ کیا بسا اوقات
یہ کہہ کے تم میری پیٹھ نہیں ٹھونکا کرتی تھیں کہ "غرض یہ مر جاؤ جینا ہے تو یہ ہے"۔ اور میں اس گیت کو
اکثر گنگنایا کرتا تھا۔ اب یہ سبق میرے غیر شعوری جنون کا ایک جزو بن کر رہ گیا ہے۔ تمہیں نے کہا تھا
نا کہ راہ چلتے ہر سفید ریش والے کو سلام کرنا ادب میں شامل ہے۔ آج کی دنیا فقط اپنے شناساؤں کو سلام کرنا
ادب سمجھتی ہے۔ میرے ہم جماعت جب مجھے ایسا کرتے دیکھتے ہیں تو وہ میری ہنسی اڑاتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی میں
جاتا ہوں اہلِ زمانہ مجھے حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں ہمیشہ تکلف کرتا ہوں۔ میرا سچ ان کے نزدیک
جھوٹ برابر ہے۔ میرے ممکن کو وہ ناممکن مانتے ہیں۔ کئی دفعہ تو میرے ہم عصر مجھے فلاسفر اس انداز میں کہتے ہیں
گویا نہ کبھی میں نے انہیں سمجھا ہی اور نہ کبھی وہ مجھے سمجھ سکے۔ اب حیران ہوں کہ کس کام آئے تمہارے اپدیش!

پھر بھی میں تمہارے ان اپدیشوں پر ہمیشہ عمل کرتا رہوں گا۔ تم نے کہا تھا نا کہ اگر کسی باپ
کی اولاد میں ایک سچا بچہ بھی انسان بن جائے اور اپنوں کے افعال کو درست کرے سارا ہی گھر انسانیت کی روشن

اپنا شعار بنا لے تو اس کی ماں درگاہِ الٰہی میں انسان پیدا کرنے والی ماؤں کی صف میں جگہ پائے گی۔ اور اگر کسی ماں کا کوئی بچہ بھی انسان نہ بن پائے تو وہ محض ان عورتوں میں جگہ پائے گی جنہوں نے فقط دو پائے پیدا کئے ہیں۔ تمہاری خاطر میں دنیا کی ٹھوکریں کھا کے کبھی انہیں اصولوں پر چلونگا جنہیں تم نے شرف انسانی قرار دیا تھا۔ اور تمہاری ہر برسی پہ بے نوا بڑھیاؤں کو کھانا کھلایا کروں گا۔ اُف! تو بھی میں ساری عمر تمہارے احسانوں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

سچ کی قسم میں تمہارے بعض اوصاف ہر ہندوستانی ماں کو سکھانا چاہتا ہوں۔ تمہارا سب سے بڑی خوبی جو مجھے یاد ہے۔ یہ تھی کہ تم مردوں کی طرح کھلے منہ ہرزہ گوئی کرتے ہوئے کبھی بازار نہ جاتی۔ آج عورتیں شرم و حیا کے پردے پھاڑ کر ایک دوسری سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔ تم نے مجھے لاڈ پیار دے کر کبھی بد اطوار نہیں بنایا تھا۔ تم بھی مجھے پیار تو کرتی تھیں پر تمہارا پیار بس تمہارے دیکھنے کے انداز میں چھپا ہوتا تھا۔ بعض مائیں بیجا پیار سے بچوں کو بگاڑ دیتی ہیں۔ اور کئی معصوموں کی یوں ٹھڈی اتارتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اور ایسی سزا سے ان کے بچے ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی نہیں جانتیں کہ ایسا کرنے سے ان کے بچے ہرگز ہرگز درست نہیں ہونے پائیں گے۔ بچپن میں ذہن بہت جلدی اثر پکڑتا ہے اور بچپن کا اثر آخری دم تک گہرا ہی ہوا جاتا ہے۔ تم نے کبھی مجھے نہ پیٹا تھا۔ تمہاری تنبیہ ہمیشہ کنایۃً ہوتی تھی۔ تم سچ کہا کرتی تھیں کہ مار سے بچے کے دل میں ماں باپ کیلئے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جوان ہو کر ایسے والدین کے بچے مؤدب نہیں رہتے۔ یعنی ماں باپ کے عمل کا ردِ عمل جاری ہو جاتا ہے۔

تم نے کبھی مجھے بندہ بنانے میں کسر نہیں چھوڑی۔ جب کبھی میں روٹھا کرتا تھا تم آنکھیں بند کر کے کہا کرتی تھیں کہ "سو رہی ہیں"۔ اور میں فوراً چھپ کے کہیں بیٹھ جایا کرتا تھا۔ آخر میں بھی فقط اتنی سی بات پہ کہ مجھے گھر آنے میں ذرا دیر ہوئی تم نے جان لیا کہ میں روٹھ گیا ہوں۔ اب تم نے آنکھیں بند کر لیں دنیا جہان کہتا ہے دنیا والوں نے مجھے بالکل سیدھا کر دیا ہے اب میں کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی یہ گستاخی نہیں کرونگا۔ پھر تم میں چھپنا بھی کوئی آنکھ مچولی ہو گیا؟ تم ایک بار آنکھیں کھول کے دیکھو تمہارا لاڈلا کس حال میں ہے۔ یاد رکھو تم نہ آؤ گی تو میں بھی ایک نہ ایک دن یہاں نہیں رہونگا ---- نہیں نہیں! میری توبہ۔ تم نے اچھا کیا جو اچھے وقت دنیا چھوڑ گئیں اور بیسویں صدی کا یہ خونی منظر نہ دیکھا۔

زیادہ ادب

(۱۵)

اُس رفیق کے نام جس کو سدا شکایت رہی کہ اچھوت اپنے گھروں میں صفائی کیوں نہیں رکھتے

پیارے اعجاز!

تم مجھے قائل کرنے کی ہزار کوشش کرو کہ اچھوت کا مسئلہ کسی بزرگ نے شروع کیا تھا۔ قدرت اس بزرگ کی روح پر رحمت کرے مجھے مرکر بھی یقین نہیں آسکتا کہ کبھی کوئی ایسا مکروہ بزرگ بھی میرے وطن میں پیدا ہوا ہوگا جو اس قدر تنگ نظر ہو۔ میں نے بھی تمہاری طرح تواریخی حوالے تو دیکھے ہیں مگر کوئی وثوق سے نہیں کہتا کہ ذات پات کی تمیز کیوں ہوئی اور کب ہوئی۔ بعض بے سمجھ لوگوں نے منو جی کا نام بدنام کیا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ یہ سب صدیوں کی سرمایہ داری کی بدولت ہوا ہے۔ تم کبھی آنکھیں کھول کے اچھوت بھائیوں کے گھروں سے تو گزر کر دیکھو کس قدر تیزی تندی کے ساتھ وہاں جابر امیروں کے لئے دوزخ کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ سچ کی قسم! وہاں تم رک نہیں سکو گے۔ جو خوشبو ان کے حصے آئی تھی وہ یہاں تک ان سے چھن چکی ہے کہ سوائے عفونت کے صاف ہوا تک کا وہاں گزر ممکن نہیں۔ تم چند لمحوں کے لئے انسانیت کو دل میں جگہ دے کے اچھوتوں کی کسی بستی میں جاؤ ہر گھر میں ایک دو مریض ایسے پاؤ گے جن کا صحت یاب ہونا ممکن نہیں، وہ ملیریا کے دائمی مریض بن گئے ہیں۔ وہ کاتتے ہیں تو انہیں تن ڈھانپنے کو لتا ہاتھ نہیں لگتا۔ ان کے ہاں ایندھن فقط اتنا ہے کہ کھانا پکانے کے بعد ایک لکڑی کا ٹکڑا بھی باقی نہیں رہ جاتا۔ انہیں اتنی بھی فراغت نہیں ملتی کہ وہ کسی بچے کو معمولی تعلیم بھی دے سکیں۔ تمہارے امیروں نے ان کے حصے میں زندگی کے ضروری سامان بھی باقی نہیں چھوڑے۔ ان کے ہاں فقط وہ چیزیں ہیں جنہیں بڑی بڑی کوٹھیوں کے امیروں نے بیماری کے جراثیم سمجھ کے پھینک دیا ہے۔ ایک ایسے کمرے میں جس میں امیروں کا ایک کتا بھی نہیں رکھا جاسکتا دس پندرہ اچھوت بھائی زندگی میں موت دیکھ رہے ہیں۔

تمھیں شکایت ہے میرے اعجاز! کہ اچھوت اپنے گھروں میں صفائی کیوں نہیں رکھتے۔ تم ہی کہو وہ اپنے گھروں میں صفائی رکھیں تو بیچارے خود کہاں رہیں۔ غلاظت تو ان کا خون بن گئی ہے۔ صفائی کو امیروں کے ہاں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے کوئی اچھوت صفائی کی طرف قدم بڑھائے تو یہ امیرزادی امیروں سے اس کے پاؤں کٹوا دیتی ہے۔

اعجاز! آج میں اپنے قصبے کے اچھوتوں کی بستی میں گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ضعیف بڑھیا جس کی آنکھیں، دانت، کان سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں بیٹھی چرخی کات رہی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ کبھی ہمارا کوڑا کرکٹ اٹھایا کرتی تھی اور اس کا خاوند ہمارے کھیتوں میں مزدوری کیا کرتا تھا۔ میرے بار بار بلانے پر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنی دھن میں بڑے سوز سے تان لگا رہی تھی۔ وہ ایک پنجابی گیت گا رہی تھی جس کے الفاظ میں جلدی نہ سمجھ سکا۔ لیکن سمجھتا میرے کانوں میں [illegible] کی سریلی آواز ابھی گونج رہی تھی۔ وہاں ایک اور نوجوان لڑکی بھی مٹی کے برتن دھو رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ چھیو ہی ہے جو کبھی تمہاری نوکرانی تھی۔ اب بیچاری اندھی اور بہری ہے۔ یہ سن کے میرے دل میں احساس آدم جاگ اٹھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کے دھیان سے سننا شروع کیا تو میری خوشی کی حد نہ رہی۔ وہ بار بار دہرا رہی تھی (وگ نی ٹھنڈیئے وائے نی میرا ویرنا کول آئے) اب بھی چھیو پر موسم بہار کے اثرات سے بالکل بے حس نہ ہوئی تھی۔ اب بھی اسے اپنے مرے ہوئے بھائی یاد آ رہے تھے۔ وہ [illegible] کے چرخی چلاتی تھی اور بار بار یہ پنجابی گیت گا کے سر دھنتی جاتی تھی۔ میں نے ایک روپیہ چھیو کے ہاتھ میں دیا اور بلند آواز میں بتا کر میں تمہاری مرحوم مالکہ کا لڑکا ہوں اور تمہاری زیارت کو آیا ہوں۔ ڈر تھا کہ چھیو خوشی کی موت نہ مر جائے۔ اس کی بے نور آنکھوں میں اک عجب چمک پیدا ہوئی اس کے پژمردہ چہرہ پر زندگی پھر رقص کرنے لگی۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں میری مرحوم والدہ

(رگ ... پنجابی بول بھائی کی یاد دلاتی ہے (اے ٹھنڈی ہوا تو چل تاکہ بھائی بہن کو ملنے آ سکے)

کو دعائیں دے رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ جیونی جیسے زندہ ہو گئی ہو میں شرم سے پانی پانی
ہوا جاتا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا مگر میرا ضمیر مجھے پیچ و تاب میں ڈال رہا تھا۔ جیونی کی محنت و
صفائی تو میرے والدین نے اس سے شفقت کر کے واپس چھین لی تھی۔ میں نے اسے
ایک ہی روپیہ دینا کیوں کافی سمجھا۔ جیونی نے وہ روپیہ میرے کیوں نہ پھینک دیا۔ اس
نے اپنی امیر مالکہ کا نام سن کر منہ بنا کر تھوکا کیوں نہیں؟ ہماری اتنی زمینوں کے باوجود ہماری
ٹھہری حویلیوں کے ہوتے ہوئے ان کے بنانے والی جیونی کیوں ایک تنگ سی کوٹھری میں
دن کاٹ رہی ہے۔ جس ہاتھ سے میں نے جیونی کے ہاتھ کو چھوا تھا وہ ناپاک کیوں محسوس
ہوتا تھا۔ اس میں جیونی کے ہاتھ سے اچھوت جراثیم داخل ہو گئے تھے۔ کیا ہم کیا اس حویلی
میں بیٹھے میرے جسم کو وہی جراثیم نہیں چھو رہے تھے جس حویلی کو جیونی نے اپنا خون پسینہ
ایک کر کے بنایا تھا؟ وہ کیوں مالکن بنی رہی بھادمہ کیوں اس میں جگہ نہ پا سکی؟ کیا
جیونی اسی مٹی میں نہیں مل جائے گی جس میں اس کی مالکہ جو مل چکی ہیں؟ کیا جیونی کے تنفس
سے اچھوت جراثیم میرے والدین کے اندر نہ چلے گئے جن دنوں جیونی ہماری حویلیوں میں کام
کیا کرتی تھی۔ کیا ساری عمر جیونی اور اس کے جیون ساتھی کی چھو سے ہماری حویلیوں
در و دیوار میں اچھوت جراثیم سرایت نہ کر سکے؟ کیا ہماری فصلوں کے ذرات میں جیونی
کے خاوند کے ہاتھوں کی چھو سے اچھوت جراثیم نفوذ نہ کر گئے۔ اگر ان کے ان سب
اعمال سے ہماری حویلیاں، ہماری فصلیں اور ہماری گائے بھینسوں کا دودھ ناپاک نہیں
ہو سکے تو جیونی کے ہاتھ کی چھو سے میرے دل میں حقارت کیوں پیدا ہوئی؟ کیا سرمایہ داری
کی لوہے کی پیٹی میں وہی نوٹ اور روپے نہیں ہیں جو جیونی اور اس کے خاوند کی کمائی سے
جمع ہوئے ہیں۔ پھر جیونی کو کیوں حویلیوں سے دور الگ تھلگ، ایک تنگ و تاریک
کوٹھری میں پھینکا گیا ہے بس اسی لئے کہ وہ غریب اچھوت ہے۔ اگر جیونی بھی امیر
ہوتی تو بھلا وہ کیوں ہمارے ہاں مزدوری کرتی؟ اسے کیا پڑی تھی جو یہ کام کرتی اور چھلیا

تعمیر ہوتیں اور ان ہی یا وہ لوگ بستے جنہوں نے کبھی ایک تنکا کبھی اٹھا کے ادھر سے ادھر نہیں رکھا اور بیچارے غریب کپڑہ دبکی ہوئی ان حویلیوں میں بحیثیت اچھوت کے آیا کرتی۔

اگر ہندو دوراس بات کو سمجھ لیں کہ سب روپیہ انہی کی محنت سے پیدا ہوتا ہے اگر وہ جان لیں کہ ملکی زمین میں ان کا برابر حصہ ہے یعنی ہماری زمین سب ہندوستانیوں کی مشترکہ مال ہے تو وہ کیوں اپنی طاقت امیروں کے ہاتھ میں دے کر خود اچھوت کہلائیں کیا اچھوت امیروں کا من گھڑت مسئلہ نہیں۔ اگر اچھوت غلیظ ہیں تو انہیں غلیظ کس نے بنایا ہے؟ اگر وہ مردار اٹھاتے ہیں تو وہ مردار کس کے ہیں؟ حیف ہے شام کو جس بھینس کا دودھ دوہا جاتا ہے اور پیا جاتا ہے وہ اسی رات کو مر جائے تو امیر اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہتے اسے اٹھانے والے بجائے امیروں کے محسن قرار دیئے جانے کے اچھوت کہلاتے ہیں لعنت امیری پر کہ صبح ہی امیر پاخانے کو خود تو چھوئے مگر اگر غریب آن کے گھر کی صفائی کے لئے اسی پاخانے کو اٹھا لیجائے تو اچھوت کہلائے اور دھتکارا جائے۔ اب تم ہی کہو اعجاز اچھوت کا مسئلہ کس بزرگ کی اختراع ہے؟ اگر امر واقعہ یوں ہے تو وہ کافر ننگِ بزرگی تھا کہ بزرگ تھا؟

میں اس دوست کو دوست نہیں مانتا جو کسی ابنِ آدم کو اچھوت خیال کرتا ہے۔ تم مجھے سو بار سمجھاؤ کہ مجھے گھر میں دلچسپی لینی چاہیئے مگر میں تو ایسے گھر کو ہر گھڑی آگ لگانے کو تیار ہوں جس میں کوئی بھی بشر اپنے تئیں اچھوت پاتا ہے۔ اچھوت وہ ہے جو کسی انسان بھائی کو اچھوت جانتا ہے حیف ہے ایک ہی مٹی سے ہم پیدا ہوں، ایک ہی مٹی کی پیداوار پر ہم سب پرورش پائیں، ایک ہی وطن کی ندیوں کا ہم سب پانی پئیں، ایک ہی وطن کی ہوائیں کھائیں اور ایک ہی مٹی میں سب مر کر ایک ہوں اور پھر کوئی اچھوت ہو اور کوئی سورن ہندو۔ میں کہتا ہوں دنیا والوں کا خدا بھی اگر کسی اچھوت کو اچھوت کہہ کے خوش ہے تو وہ خدا خود اچھوت خدا ہے اور خدائی کے شایاں نہیں۔

(۱۴)

ان ہندوؤں کے نام جس نے کبھی نہ سوچا کہ ہندو مسلم

تعصب آخر رنگ لائیں گے!

کیا وہ اس کیکر کی چھڑی کو چندن کی چھڑی سے کچھ کم سمجھتا تھا۔ پھر یہ چھڑی اگر اسے چھین جاتی اور چھین بھی محض اس لئے جاتی کہ حسن مسلم ہے تو کیا تمام عمر حسن کے دل میں منوہر بابو کے لئے نفرت نہ بیٹھ جاتی؟ کیا اس چھڑی کو یوں واپس کر دینے والا ہندوستانی بھائیوں کو آب حیات پلانے کا کام نہیں کر رہا تھا۔ اور اگر ہزار کتابوں سے ایک دل بہتر ہو سکتا ہے تو کیا ایک غریب بچے کو خوش کرنے والے نے حج اکبر کا ثواب نہیں پایا۔ کیا تم میری عمر کے اس حصے کو بھی بربادیٔ وقت کہو گے؟ کیا ہی اچھا ہو ممتاز! جو ہندوستان میں چھوٹے بچوں کی تدریس کے واسطے ایسے استاد پیدا ہو جاویں جو حسن و منوہر کے چھپے پٹ کے انھیں ایسی اسلامیت اور ہندیت سے دور رکھ سکیں جو حب الوطنی کے گلے پر کند چھری بن جاتی ہے جو سکھایا کریں کہ وطن بھائی باہم سینہ زوری کو اپنا شیوہ نہیں بناتے۔ مگر کون جانے کہ آج کے شاگرد کل کے استاد ہیں۔ اور کسی ملک کے باشندوں کا اپنے بچوں کو ایسے سبق پڑھانا خانہ جنگی کی تعلیم دینا قومی خودکشی سے کم نہیں۔

ممتاز! آج پھر حسن و منوہر پھر ملے۔ حسن کے پاس دیسی پلا تھا حسن رہ رہ کر میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے پاس پہنچ کر پوچھا۔

کہئے حسن میاں! یہ پلا کہاں سے منگوایا ہے؟

جانی والے سے! (حسن نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا)

کون لایا ہے اتنی دور سے یہ پلا؟

میرے ماموں۔

کیا کام کرتے ہیں تمہارے ماموں وہاں؟

سنگھاڑے کا۔

حسن بھائی کی دلجوئی کرنے کے لئے اس کا بچھڑا ہوا پلا میں نے اٹھا لیا اور

۱؎ پاکستان میں جانی وال ملتان لائن پر ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔

پوچھا کہ گوشت ہی کھاتا ہوگا کھانا یا پلاؤ؟
گوشت بھی فقط سالی بھیڑ کا (حسن نے ذرا اترا کے کہا)

اس معصوم جواب پر میری ہنسی چھوٹ گئی - میں نے ہنسی دباتے ہوئے کہا کہ شکل بھی اس کی ہو بہو اسامی جیسے جیسی ہے - اس پر حسن کی باچھیں کھل گئیں اور بولا (تم بھی اس کا ایک پلا لے لینا -)

حسن کی یہ دریا دلی دیکھ کے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا - شاباش شاباش کہتا ہوا میں وہاں سے چل دیا - اور سوچ رہا تھا کہ حسن سمجھتا اپنے پلے کا بچہ تو دیا اللہ دیا میں ہر روز دعا مانگا کرتا ہوں کہ بھگوان حسن کے پلے کو سردی سے محفوظ رکھے -

[illegible] سنگھ -

(۱۵)

سُہیا!

میں نے وعدہ ایفا کر دیا ہے۔ شکر ہے تمہاری آئے دن کی شکایت دور ہوئی۔ میری وہ زندگی ختم ہوئی جس میں تمہیں تصنع کی جھلک نظر آتی رہتی تھی۔ ہاتھ کی یہ تھرتھراہٹ میری غیر شعوری جنبش لب کا پس ماندہ اشارہ ہے

خدا حافظ

نہایت دلچسپ مفید اور کارآمد کتابیں

ہندی

کتاب	قیمت
تارا کا گڈنڈا	۱۳ر
لوسنے کا بٹوہ	۱۲ر
انار راجہ	۱۳ر
پری کی چھڑی	۵ر
بطخ شہزادی	۵ر
پرستان کی سیر	۵ر
ہمارا گاندھی	۸ر
ہمارا جواہر	۸ر
ہمارا پٹیل	۸ر
ہمارا سبھاش	۸ر
ہمارا آزاد	۸ر
پیارا باپو	۶ر
راجہ جی	۶ر
راجندر پرشاد	۶ر
پٹابھی سیتا رامیہ	۶ر
پیارا جواہر	۶ر

کتاب	قیمت
دیش بھگت شیام	۱؎
دھرم دھاری رام	۱؎
ویر درشن	عہ
سیوا جی	۸؎
ہری سنگھ نلوہ	۸؎
نیتا جی کے ساتھی	سے
جواہر لال نہرو	عہ
گن دیوتا	عہ

اردو

کتاب	قیمت
مذہب اور انسانیت	۸؎
ہندوستان کا مستقبل	۸؎
زاد راہ	۸؎
پردۂ مجاز	للعہ
کائنات دل	ے
خواب و خیال	عہ
واردات	عہ
امریکہ کے بچے	۸؎
دیپا سُر	عہ
چٹکی	عہ
دھواں	سے
رضیہ ماڈرن فیشن بک	للعہ
رضیہ کا شاہی دستر خوان	ہے
دلی کی دنیا	۸ر
پنکھڑیاں	۸ر
صنعت و حرفت کے راز	لعہ
سائنس کی روشنی میں	عہ
ہندوستانی جڑی بوٹیاں	عہ
تجربات طب قدیم و جدید	عہ
معالجات جدید	سے
تشریح معالجین	للعہ
فروق الامراض	عہ
اچھے بنو	۶ر
ہنسو کھیلو	۶ر
چور پکڑا گیا	۶ر

سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم دریا گنج دہلی